© rasailojaraid.com

مقالات

سود میں نئے مباحث کا اضافہ

(مولانا سید ابو الاعلیٰ صاحب مودودی)

(۴)

اشتراکیت کا ردِّ عمل

روس میں اشتراکیت نے اپنا نظام قائم کرنے کے لئے جتنے بڑے پیمانے پر، جیسے سخت ہولناک ظلم کیئے، اور پھر اس انقلاب کی کامیابی نے دنیا کے ہر ملک میں طبقاتی جنگ کی سلگتی ہوئی آگ پر جو تیل چھڑکا، اس نے تمام غیر اشتراکی ممالک کے اہل فکر کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ وہ بے قید معیشت کے اصولوں اور طریقوں میں کیا ترمیم کریں جس سے محنت پیشہ طبقوں کی شکایات رفع ہوں اور ان کا ملک اشتراکی انقلاب کے خطرے میں پڑنے سے بچ جائے۔ اگرچہ بے قید معیشت کی برائیاں اسی وقت سے نمایاں ہونی شروع ہو گئی تھیں جب سے جدید سرمایہ داری کا نظام قائم ہوا۔ اس پر تنقید برابر ہوتی رہی۔ اس میں سطحی اور جزوی اصلاحات بھی کچھ نہ کچھ ہوتی رہیں، لیکن تغیر، ترمیم اور اصلاح کی ضرورت کا حقیقی احساس روسی اشتراکیت کے عمل، اثرات اور نتائج کو دیکھ کر ہی پیدا ہوا، اور اس ردِّ عمل نے نظام سرمایہ داری کے دو بڑے بڑے علاقوں میں دو مختلف صورتیں اختیار کیں۔

جن قوموں کے نظام زندگی کو جنگ عظیم اوّل نے بری طرح درہم برہم کر دیا تھا، اور جنہیں اشتراکیت کی بھڑکائی ہوئی طبقاتی جنگ سے کامل تباہی کا خطرہ لاحق ہو گیا تھا، اور جن کی سرزمین میں جمہوریت کی جڑیں کچھ مضبوط بھی نہ تھیں، ان کے ہاں فاشزم اور نازی ازم نے جنم لیا۔

جن قوموں میں جمہوریت مضبوط بنیادوں پر قائم تھی اور جن کے نظام زندگی میں جنگ نے کچھ بہت زیادہ خلل بھی نہیں ڈالا تھا انہوں نے اپنی پرانی وسیع المشرب جمہوری سرمایہ داری کو اس کی فطری بنیادوں پر قائم رکھتے ہوئے صرف اس کی بے قیدی میں ایسی اصلاحات کرنے کی کوشش کی جس سے اس کے نقصانات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دُور ہو جائیں۔

فاشزم اور نازی اشتراکی حضرات بالعموم اِن دونوں مسلکوں کو سرمایہ داری کی رجعت قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں اور الزام رکھتے ہیں کہ بوڑھا سرمایہ داروں نے اپنی بازی ہرتی دیکھ کر ہٹلر اور مسولینی کو کھڑا کر دیا تھا لیکن یہ اصل حقیقت نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ کسی طبقے یا کسی مخصوص مفاد کے بدنیت ایجنٹ نہیں تھے مارکس اور لینن ہی کی طرح کے لوگ تھے۔ ویسے ہی مخلص، ویسے ہی ذہین، اور ویسے ہی کج فہم۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک طرف جنگ کی زبردست چوٹ نے ان کی قوم کو اس قدر بدحال کر دیا ہے کہ صدیوں کا قومی فخر و ناز خاک میں ملا جاتا ہے۔ دوسری طرف بے قید معیشت کی اندرونی خرابیاں اور اشتراکیت کی اوپری انگیخت قوم کے مختلف عناصر کو آپس ہی میں ایک سخت خونریز اور غارت گر کشمکش میں مبتلا کیے دے رہی ہیں۔ اس لیے انہوں نے ایسی تدبیریں سوچنی شروع کیں جن سے وہ طبقاتی اغراض کی اندرونی نزاع کو دور کر کے اپنی قومی وحدت کو پارہ پارہ ہونے سے بھی بچا لیں اور اپنی قوم کی معاشی، تمدنی اور سیاسی طاقت کو مضبوط کر کے از سرِ نو اس کی عظمت کا سکہ بھی دنیا میں بٹھا دیں لیکن وہ اور ان کے حامی اور پیرو، سب کے سب مغربی ذہن کی اُن ساری کمزوریوں کے وارث تھے جنہیں ہم تاریخ میں مسلسل کارفرما دیکھتے چلے آ رہے ہیں۔ اپنے پیش رو مفکرین و مدبرین کی طرح انہوں نے بھی یہی کیا کہ چند صداقتوں کو لے کر ان کے اندر بہت سے مبالغے کی آمیزش کی، چند صداقتوں کو ساقط کر کے ان کی جگہ چند حماقتیں رکھ دیں، اور اس ترکیب سے ایک نیا غیر متوازن نظامِ زندگی لا کھڑا کیا۔

آیئے اب ذرا اس مرکب کا بھی جائزہ لے کر دیکھیں کہ اس میں صحیح اور غلط کی آمیزش کس طرح کس تناسب سے تھی اور اس کے نفع و نقصان کی میزان کیا رہی۔ اگرچہ جنگِ عظیم دوم میں شکست کھا کر یہ دونوں توأم بھائی بظاہر مر چکے ہیں، لیکن ان کی پھیلائی ہوئی بہت سی بدعتیں بدلے ہوئے ناموں سے مختلف ملکوں میں اب بھی موجود ہیں اور خود ہمارا ملک بھی ان بلاؤں سے محفوظ نہیں ہے۔ اس لیے فاشیت اور نازیت کے اجزاءِ صالح اور اجزاءِ فاسد کی نشان دہی اب بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی جنگ سے پہلے تھی۔

صحیح اور مفید کام فاشی اور نازی حضرات اشتراکیوں کے اس خیال کو رد کر دینے میں بالکل حق بجانب تھے کہ ایک معاشرے اور ایک قوم کے زمیندار و سرمایہ دار طبقات اور محنت پیشہ طبقات کے درمیان صحیح اور فطری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تعلق صرف نفرت، عناد اور جنگ ہی کا تعلق ہے۔ ان کا یہ خیال بالکل صحیح تھا کہ اصل چیز طبقہ نہیں بلکہ معاشرہ اور قوم ہے جس کے مختلف اجزا و اعضاء اپنے مجموعہ کے لئے مختلف خدمات انجام دیتے ہیں۔ ان کے درمیان حقیقی تعلق، دشمنی اور جنگ اور پیکار کا نہیں بلکہ موافقت اور تعاون اور تعامل کا ہے۔ ان کا کام یہ ہے کہ سب مل کر سب کے لئے اشیاء ضرورت پیدا کریں اور اجتماعی پیداوار کو بڑھا کر قومی دولت اور طاقت میں اضافہ کریں۔ اس موافقت اور تعاون میں اگر کوئی کمی یا خلل ہو تو اسے دور ہونا چاہیئے۔ نزاع و اختلاف ہو تو اسے رفع ہونا چاہیئے نہ یہ کہ وہ بڑھے اور ایک ہی معاشرے کے اجزا ایک دوسرے کو فنا کر دینے پر تل جائیں۔

انہوں نے اشتراکیت کے اس نظریہ کو بھی بیجا طور پر رد کر دیا کہ اجتماعی مفاد کے لئے انفرادی ملکیت اور ذاتی نفع طلبی بجائے خود کوئی نقصان دہ چیز ہے جسے ختم ہو جانا چاہیئے۔ ان کا یہ خیال بالکل صحیح تھا کہ یہ دونوں چیزیں خود اجتماعی مفاد ہی کے لئے مفید اور ضروری ہیں، بشرطیکہ یہ بے قید معیشت کی طرح غیر محدود نہ ہوں بلکہ کچھ حدود کے ساتھ محدود کر دی جائیں۔ انہوں نے کہا کہ افراد کو اپنے نفع کے لئے جدوجہد کرنے کا حق تو ضرور رہے مگر اس حق کا استعمال اجتماعی مفاد کے تحت اور اس کے مطابق ہونا چاہیئے نہ کہ اس کے خلاف۔ مرکزی مالیات High Finance، معدنیات، جہاز سازی و جہاز رانی، سامان جنگ کی صنعت اور ایسے ہی دوسرے بڑے کاروبار Big Business انفرادی ملکیت میں نہ رہنے چاہئیں۔ ایسے اجاروں کو بھی ختم ہونا چاہیئے جن میں اجتماعی مفاد کو شخصی مفاد پر قربان کیا گیا ہو۔ تجارت میں سے سٹے کو قطعی بند ہونا چاہیئے۔ قرض و استقراض کے نظام میں سے سود کو بالکل ساقط ہو جانا چاہیئے[1]۔ اور کاروبار کو ایسے قواعد و ضوابط کا پابند ہونا چاہیئے جو اس سے تعلق رکھنے والے سب لوگوں کے مفاد سے مطابقت رکھتے ہوں نہ کہ صرف ایک گروہ کے مفاد سے۔ اس کے بعد اگر ایک کارخانہ دار قیمتیں مناسب رکھتا ہے، مال اچھا تیار کرتا ہے، اپنے مزدوروں کو خوشحال اور خوشدل رکھتا ہے، اپنی صنعت کو ترقی دینے کی کوشش کرتا رہتا ہے، اور اپنی ان خدمات کے معاوضے میں جائز حدود کے اندر رہ کر منافع لیتا ہے تو وہ آخر کس جرم کا مرتکب ہے کہ خواہ

[1] اگرچہ یہ لوگ سود کو عملاً بند نہ کر سکے، اور خود اسٹیٹ نے قرض لے کر اس پر سود ادا کیا، لیکن نازی اور فاشسٹ، دونوں، سود کو برا جانتے تھے اور اسے بند کرنے کے قائل تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مخواہ اسے دشمن جماعت قرار دیا جائے؟

انہوں نے پرانی وسیع المشربی کے اس نظریہ کو بھی بالکل بیجا طور پر رد کر دیا کہ حکومت صرف پولیس اور عدالت کے فرائض انجام دے اور معاشی زندگی کے کاروبار سے کچھ غرض نہ رکھے۔ انہوں نے کہا کہ قومی معیشت کے مختلف عناصر کے درمیان ہم آہنگی اور توافق اور تعاون پیدا کرنا اور نزاع و کشمکش کے اسباب کو دور کرنا قومی ریاست کے فرائض میں سے ہے۔ انہوں نے ایک طرف ہڑتال کو اور دوسری طرف کارخانے بند کرنے کو از روئے قانون ممنوع ٹھہرایا۔ اجیروں اور مستاجروں کی مشترک کونسلیں بنائیں۔ ان کے درمیان حقوق و فرائض انصاف کے ساتھ مقرر کرنے کی کوشش کی۔ اور ان کے جھگڑوں کو چکانے کے لئے باہمی گفت و شنید پھر پنچایت اور بالآخر عدالتی فیصلہ کا ایک باقاعدہ نظام مقرر کر دیا۔

انہوں نے سرمایہ داری نظام کی اس خرابی کو دور کرنے کی بھی کوشش کی کہ جو لوگ بیکار ہوتے ہیں یا ناکارہ ہو جاتے ہیں ان کی خبرگیری کا کوئی ذمہ دار نہیں ہوتا۔ اس طرح بے وسیلہ لوگوں کو بے سہارا چھوڑ دینے کے جو نقصانات ہو سکتے ہیں نازیوں اور فاشیوں نے ان کو محسوس کیا اور بہت وسیع پیمانے پر سوشل انشورنس کا اہتمام کیا جس کے ذریعہ سے بیماری، بڑھاپے، بیکاری، اور حادثات کی صورت میں کارکنوں کو مدد دی جاتی تھی۔ نیز انہوں نے ماؤں اور بچوں کی نگہداشت، فلاح اطفال، اپاہجوں اور معذوروں کی خبرگیری، جنگ میں ناکارہ ہو جانے والوں کی امداد، لاوارث بوڑھوں کی دیکھ بھال اور ایسے ہی دوسرے امور خیریہ کے لئے عظیم الشان ادارے قائم کئے۔ جنگ سے پہلے جرمنی میں اس طرح کا جو ادارہ قائم تھا اس نے تقریباً ۵ لاکھ افراد کو سنبھال رکھا تھا۔

انہوں نے بے قید معیشت کے اس عیب کو دور کرنے کی طرف بھی توجہ کی کہ سارا معاشی کاروبار بغیر کسی نقشے اور منصوبے اور ہم آہنگی کے چلتا رہتا ہے اور اس کی وجہ سے معاشی وسائل پوری طرح سے استعمال بھی نہیں ہوتے اور جتنے کچھ استعمال ہوتے ہیں ان میں توازن نہیں ہوتا۔ اس خرابی کو دور کرنے کے لئے انہوں نے قومی معیشت کی رہنمائی اور تنظیم و توفیق Co-ordination کا کام اسٹیٹ کے ہاتھ میں لیا، معاشی زندگی کے تمام شعبوں کی کونسلیں بنائیں، اور ایک منضبط اور منظم طریقے سے پیداوار کے وسائل اور قوتوں کو استعمال کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح انہوں نے بے روزگاری کا خاتمہ کر دیا؎۔ پیداوار میں حیرت انگیز اضافہ کیا، اور مختلف

؎ ۱۹۳۲ء میں جب نازی پارٹی برسر اقتدار آئی تھی تو جرمنی میں تقریباً ۶۰ لاکھ آدمی بیکار تھے۔ مگر چند سال بعد نوبت یہ آگئی کہ جرمنی کو کارکنوں کی کمی کا شکوہ تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شعبوں میں ہموار ترقی کی۔

حماقتیں اور نقصانات یہ تھیں فاشیت اور نازیت کی برکات۔ مگر ان برکات کے لئے اٹلی اور جرمنی کو قیمت کیا دینی پڑی؟

نازی اور فاشی حضرات نے طبقاتی منافرت کے افتراق انگیز اثرات کا مداوا قوم پرستی کی شراب سے، نسلی فخر و غرور کے جنون سے، دوسری قوموں کے خلاف نفرت اور غیظ و غضب کے اشتعال سے، اور عالمگیری و جہاں کشائی کے جذبات سے کیا جس کا انجام کبھی کسی قوم کے حق میں بھی اچھا نہیں ہوا ہے۔ قوموں کا صحیح نشو و نما اور اٹھان اگر ہو سکتا ہے تو صرف تعمیری اخلاقیات اور ایک صالح نصب العین ہی کے بل پر ہو سکتا ہے۔ جو لیڈر اس طریقہ کو چھوڑ کر قومیت کے احتکام و ترقی کے لئے نفرت اور خطرے اور اشتعال ہی کو مستقل وسائل کے طور پر استعمال کرنے لگتے ہیں وہ اپنی قوم کا مزاج بگاڑ دیتے ہیں اور ایسے ذرائع سے اٹھی ہوئی قوم ایک نہ ایک دن بری طرح ٹھوکر کھا کر گرتی ہے۔

انہوں نے اپنی قوم کی بھلائی کے لئے معاشی و تمدنی اصلاح کا جو پروگرام بنایا اسکو سیدھے سیدھے معقول طریقے سے نافذ کرنے کے بجائے ایک نہایت لغو اجتماعی و سیاسی فلسفہ گھڑا جو بے شمار مبالغہ آفرینیوں اور عملی حماقتوں کا مرکب تھا۔ انہوں نے پہلے یہ مقدمہ قائم کیا کہ "فرد قائم ربط ملت سے ہے ورنہ کچھ نہیں"۔ پھر اس پر یہ ردا چڑھایا کہ ربطِ ملت میں جو فرد شامل نہیں ہوتا یا اس ربط کے قیام میں مانع ہوتا ہے اسے واقعی کچھ نہ رہنا چاہیئے۔ اس کے بعد استدلال کی عمارت یوں کھڑی کی کہ ربطِ ملت کا اصل مظہر ہے قومی ریاست، اور قومی ریاست کے ضبط و استحکام کا انحصار ہے اُس پارٹی پر جو قومی وحدت اور ترقی کا یہ پروگرام لے کر اٹھی ہے، لہٰذا "جرمن ہے تو نازی پارٹی میں آ" اور "اطالین ہے تو فاشست ہو جا"۔ اس طرح قوم اور ریاست، اور حکومت اور حکمراں پارٹی کو ایک ہی چیز بنا ڈالا گیا۔ ہر اس شخص کو قوم اور قومی ریاست کا دشمن قرار دیا گیا جس نے برسر اقتدار پارٹی سے کسی معاملہ میں اختلاف کی جرأت کی۔ تنقید اور بحث اور آزادی رائے کو ایک خطرناک چیز بنا دیا گیا۔ ایک پارٹی کے سوا ملک میں کوئی دوسری پارٹی زندہ نہ رہنے دی گئی۔ انتخابات محض ایک کھیل بن کر رہ گئے۔ قوم کے دماغ پر ہر طرف سے مکمل احاطہ کرنے کے لئے پریس، ریڈیو، درس گاہ، آرٹ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لٹریچر اور تھیٹر کو بالکل حکمراں پارٹی کے قبضہ میں لے لیا گیا۔ تاکہ قوم کے کانوں میں اسکی آواز کے سوا کسی طرف سے کوئی دوسری آواز پہنچنے ہی نہ پائے۔ یہی نہیں بلکہ ایسی تدبیریں اختیار کی گئیں کہ اوّل تو غالب پارٹی کی رائے کے سوا کوئی رائے دماغوں میں پیدا ہی نہ ہو، اور اگر کچھ نالائق دماغ ایسے نکل آئیں جو خداوندانِ ملّت کے خیالات سے مختلف خیالات رکھتے ہوں تو یا تو ان کے خیالات ان کے دماغ ہی میں دفن رہیں یا پھر ان کے دماغ زمین میں دفن ہو جائیں۔

انہوں نے بظاہر یہ بڑا ہی معقول سا نظریہ اختیار کیا کہ اجتماعی زندگی میں کوئی مرکزی منصوبہ بندی نہ ہونے کی وجہ سے انتشار، بدنظمی، اور باہمی کشمکش بھی پیدا ہوتی ہے اور مجموعی طور پر طاقت اور ذرائع کا ضیاع بھی بہت بڑے پیمانے پر ہوتا ہے، لہٰذا پوری قومی زندگی کو منظم ہونا چاہیئے اور ایک مرکزی حکم کے تحت، ایک مرکزی طاقت کے مقرر کئے ہوئے نقشے پر تمام افراد کو بالکل ایک مشین کے پرزوں کی طرح باقاعدہ کام کرنا چاہیئے۔
انہوں نے خیال کیا کہ پیداوار، اور ترقی اور خوشحالی کو تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھانے کی یہی ایک صورت ہے۔
چنانچہ اس نظریہ کے مطابق انہوں نے سارے ملک کی زندگی کو اس کے تمام معاشی، تمدنی، مذہبی، تہذیبی اور سیاسی پہلوؤں سمیت ایک ضابطے میں کس ڈالا اور ایک بنے بندھے منصوبے پر چلانا شروع کر دیا۔
اُن کے نظامِ زندگی میں سب کچھ مقرّر تھا۔ ہر شخص اور ہر ادارے کا کام مقرر۔ اجرتیں مقرر۔ قیمتیں مقرر۔ حقوق اور فرائض مقرر۔ قوتوں اور قابلیتوں کے استعمال کی صورتیں مقرر۔ سرمائے اور وسائل و ذرائع کے مصرف مقرر۔ حتیٰ کہ فکر و خیال اور جذبات و رجحانات کی راہیں تک مقرر۔ اور ان سب کے لئے کئی کئی سال کے پروگرام مقرر۔
اب یہ ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے محض قوم کی خاطر آتنی تکلیفیں اٹھا کر اور آتنی مغز زنی کر کے پوری قومی زندگی کی اتنے بڑے پیمانے پر منصوبہ بندی کی ہو، وہ بھلا کیسے برداشت کر لیتے کہ ایک شخص اٹھے اور ان پر تنقید کر کے دماغوں میں انتشار پھیلائے، جن کارکنوں کو کام میں منہمک ہونا چاہیئے انہیں بحث میں الجھا دے، اور آتنی محنت سے بنائے ہوئے منصوبے پر سے عوام الناس کا اطمینان اور اعتماد ختم کر دے۔
پس یہ "منصوبہ بند" زندگی کی اندرونی منطق ہی کا تقاضا تھا جس کی بنا پر وہ تنقید اور رائے زنی کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھے اور اس بات پر مصر تھے کہ جس کو بولنا ہو وہ ہمارے پروگرام کی موافقت میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بولے ورنہ اپنا منہ بند رکھے، منصوبہ بندی ہوگی تو زبان بندی اور خیال بندی بھی ضرور ہوگی۔ اختلافِ رائے بند، بحث بند، تنقید بند، مواخذہ اور احتساب بند، بلکہ چند خاص دماغوں کے سوا ساری قوم کے دماغوں کا سوچنا بھی بند۔

یہاں پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ نازی اور فاشی مسلک جو کچھ دیتے ہیں کیا وہ اس قیمت پر لینے کے قابل ہے کہ ساری قوم میں چند انسان تو ہوں انسان، اور باقی سب بن کر رہیں مویشی، بلکہ ایک مشین کے بے جان پرزے۔ اس قیمت پر یہ اطمینان نصیب ہوتا ہے کہ سب کو چارہ برابر ملتا رہے گا!

نظامِ سرمایہ داری کی اندرونی اصلاحات

اب ہمیں ایک نظر یہ بھی دیکھ لینا چاہیئے کہ جن ممالک میں وسیع الشرب جمہوریت کی جڑیں مضبوط تھیں انہوں نے نظامِ سرمایہ داری کو اسکی اصل بنیادوں پر قائم رکھتے ہوئے اس کے اندر کس قسم کی اصلاحات کیں اور ان سے کیا نتائج برآمد ہوتے۔

جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں، اٹھارویں صدی میں بورژوا طبقہ ایک طرف اپنے معاشی مفاد کے لئے بے قید معیشت کے اصول پیش کر رہا تھا اور دوسری طرف یہی طبقہ اپنے سیاسی مفاد کے لئے جمہوریت، مساوات، اور حاکمیتِ عوام کا صور پھونک رہا تھا، آزادی رائے، آزادی ضمیر، آزادی تحریر و تقریر اور آزادی اجتماع کے حقوق کا مطالبہ کر رہا تھا، حتیٰ کہ اس بات پر بھی زور دے رہا تھا کہ ناقابلِ برداشت جبر کے مقابلہ میں رعایا کو حکومت کے خلاف بغاوت کرنے کا حق ہے۔ ابتدا میں جب یہ لوگ ان نظریات کو پیش کر رہے تھے تو ان کے پیشِ نظر شاہی خاندان، مالکِ زمین طبقے اور ارباب کلیسا تھے۔ سامنے وہ ان کو دیکھتے تھے اور مقابل میں صرف اپنے آپ کو پاتے تھے۔ اس لئے ان کو بالکل یہ محسوس نہ ہوا کہ وہ ایک طرف جس بے قید انفرادیت پر معاشی نظام کی بنیادیں اٹھا رہے ہیں اور دوسری طرف سیاسی نظام کی عمارت جس جمہوریت اور تمدنی مساوات پر تعمیر کر رہے ہیں، یہ دونوں کبھی ایک دوسرے کی ضد ثابت ہوں گی اور آپس میں ایک دوسرے سے متصادم ہو جائیں گی۔

جب ان کی جدوجہد سے نئے جمہوری نظام نے مختلف ممالک میں جنم لینا شروع کیا اور ووٹ کا حق مالکانِ زمین سے گزر کر تاجروں، کارخانہ داروں اور ساہوکاروں تک وسیع ہوا تو پھر یہ ممکن نہ رہا کہ کسی دلیل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے اسکو مزدوروں اور کاشتکاروں اور محنت پیشہ عوام تک پہنچنے سے روکا جا سکے۔ بورژوا حضرات نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن ان کی اپنی ہی منطق ان کے خلاف کام کرنے لگی، یہاں تک کہ آہستہ آہستہ ان کو اسی طرح عوام کا حق رائے دہی تسلیم کرنا پڑا جس طرح پہلے مالکان زمین کو خود ان کا حق ماننا پڑا تھا۔ پھر کسی دلیل سے یہ بات بھی معقول ثابت نہ کی جا سکتی تھی کہ مستاجروں کے لئے تو اپنی تنظیم جائز ہو اور اجیروں کے لئے جائز نہ ہو۔ یا مستاجر تو اپنی شرائط اپنی متحدہ طاقت سے اجیروں پر عاید کریں مگر اجیر اپنی جماعت کے زور سے اپنی شرائط منوانے کے مجاز نہ ہوں۔ اس طرح رفتہ رفتہ مزدوروں اور ملازموں کا یہ حق بھی تسلیم کر لیا گیا کہ وہ اپنی انجمنیں بنائیں، اکیلے اکیلے نہیں بلکہ مجموعی طاقت سے اجرتوں اور تنخواہوں اور شرائطِ کار کے نئے سودا چکائیں، اپنی شکایات رفع کرانے کے لئے ہڑتال کا حربہ استعمال کریں، اور ہڑتال کو کامیاب بنانے کے لئے پہرہ لگائیں۔

انیسویں صدی کے خاتمہ کے ساتھ سیاست کا یہ پرانا نظریہ بھی ختم ہونے لگا کہ ریاست کا کام فقط شخصی آزادی کی حفاظت ہے اور قومی زندگی میں ریاست کے ایجابی فرائض کچھ بھی نہیں ہیں۔ اب اسکی جگہ یہ احساس خود بخود ابھرنا شروع ہوا کہ ایک جمہوری ریاست تو خود باشندگان ملک ہی کی متفقہ مرضی کی مظہر ہوتی ہے اور جمہور اپنی ہی سیاسی طاقت کو ریاست کی شکل میں مرتکز اور منظم کرتے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ پرانی شاہی حکومتوں کی طرح اب جمہوری حکومت کے دائرہ عمل کو بھی محدود رکھنے پر اصرار کیا جائے۔ جمہوری حکومت کے فرائض محض سلبی نہ ہونے چاہئیں بلکہ اسے ایجابی طور پر اجتماعی مفاد کے لئے کام کرنا چاہیئے، اور اگر معاشرے میں بے انصافیاں پائی جاتی ہوں تو قانون سازی اور انتظامی مداخلت، دونوں کے ذریعہ سے اسکو اُن کا تدارک کرنا چاہیئے۔

حالات یہاں تک پہنچ چکے تھے کہ یکایک جنگ عظیم اول پیش آگئی، پھر روس میں وہ اشتراکی انقلاب برپا ہوا جس نے بورژوا طبقہ کے زن بچے تک کو کولہو میں پیل دیا۔ پھر جرمنی اور اٹلی میں اس کا ردِ عمل فاشیت اور نازیت کی شکل میں رونما ہوا جس نے بورژوا اور محنت پیشہ عوام، سب کو ایک سخت جابرانہ نظام میں کس دیا۔ ان واقعات نے سرمایہ داری کو اچھا خاصا "روشن خیال" بنا دیا اور وہ کچھ تو عوام کی بڑھتی ہوئی طاقت کے دباؤ سے، اور کچھ خود اپنی مرضی سے پرانی بے قید معیشت کے نظام میں حسب ذیل تغیرات قبول کرتی چلی گئی:

۱۔ ہر شعبۂ معیشت میں مزدوروں اور ملازموں کی اجتماعی تنظیمات کو باقاعدہ تسلیم کر لیا گیا ہے جو ان کی طرف سے بات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرنے کی مجاز ہیں۔ اس کے ساتھ ایک حد تک رسمی یا قانونی طور پر بعض ایسی عملی تدبیروں کو بھی جائز و معقول مان لیا گیا ہے جنہیں مزدوروں اور ملازموں کی انجمنیں اپنے مطالبات منوانے اور ان کی خاطر دباؤ ڈالنے کے لئے استعمال کر سکتی ہیں۔ اس طرح اگرچہ سرمایہ و محنت کی کشمکش ختم تو نہیں ہوئی، لیکن محنت اب سرمایہ کے مقابلہ میں اُتنی بے بس بھی نہیں رہی ہے جتنی بے قید معیشت کے دور میں تھی۔

۲۔ اجرتوں میں اضافہ، اوقاتِ کار میں کمی، کام کرنے کے حالات میں نرمی، عورتوں اور بچوں سے محنت لینے پر پابندی، مزدور کی جان اور صحت کی نسبتہً زیادہ پروا، اس کے گھر اور ماحول کو پہلے سے بہتر بنانے کی کوشش، جسمانی نقصان پہنچ جانے کی صورت میں اس کی کچھ نہ کچھ تلافی، اور پھر سوشل انشورنس کی بھی بعض اسکیموں کی ترویج، یہ سب کچھ اگرچہ اُس حد تک نہیں ہوا جتنا ہونا چاہیئے تھا، لیکن بہر حال اب مزدوروں اور نچلے طبقے کے ملازموں کا حال اُتنا خراب بھی نہیں ہے جتنا پہلے تھا۔

۳۔ حکومت کی یہ حیثیت تسلیم کر لی گئی ہے کہ وہ محنت اور سرمایہ کے درمیان حکم بنے۔ نیز ان کی باہمی کشمکش کو دور کرنے اور ان کے جھگڑے چکانے کی مختلف قانونی صورتیں بھی مقرر کر دی گئی ہیں۔ یہ چیز اگرچہ اس حد تک نہیں پہنچی ہے کہ ہر شعبۂ معیشت میں اجیر اور مستاجر کے درمیان حقوق و فرائض کا منصفانہ تعین کر دیا جائے، اور ابھی معاشی نزاعات میں عدالتی فیصلہ دینے کا کام بھی حکومت نے پوری طرح سے اپنے ہاتھ میں نہیں لیا ہے، لیکن اصولاً حکومت کا یہ منصب تسلیم کر لیا گیا ہے۔

۴۔ یہ اصول بھی مان لیا گیا ہے کہ انفرادی نفع اندوزی پر ایسی پابندیاں عائد ہونی چاہئیں جن سے وہ اجتماعی مفاد کے خلاف نہ ہونے پائے۔ اور یہ کہ ایسی پابندیاں عائد کرنا حکومت ہی کے فرائض میں سے ہے۔

۵۔ بعض ایسی معاشی خدمات کو حکومتوں نے خود اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے جو یا تو انفرادی کاروبار کے بس کی نہیں ہیں، یا جنہیں افراد کے قبضہ میں دینا مجموعی مفاد کے خلاف ہے۔ مثلاً ڈاک اور تار اور وسائلِ حمل و نقل کا انتظام۔ سڑکوں اور شاہراہوں کی تعمیر اور ان کو درست حالت میں رکھنا۔ جنگلات کی پرداخت اور ان کا نظم و نسق۔ آب رسانی اور آب پاشی۔ برق آبی کی پیدائش اور تقسیم۔ روپے کا کنٹرول اس کے علاوہ اکثر حکومتوں نے معدنیات کو بھی اپنے اجارے میں لے لیا ہے اور بعض بڑی بڑی صنعتوں کو اپنے انتظام میں چلانا شروع

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کر دیا ہے۔

۲۔ تھوڑی تھوڑی آمدنیاں رکھنے والے ملازموں اور مزدوروں کے لئے ایسے مواقع پیدا کر دیئے گئے ہیں کہ وہ تھوڑا تھوڑا پس انداز کر کے تجارتی اور صنعتی کمپنیوں میں کم قیمت کے حصے خرید لیں۔ اور بعض جگہ ایسی صورتیں بھی اختیار کی گئی ہیں کہ خاص خاص قواعد کے مطابق ملازموں اور مزدوروں کی اجرتوں کا ایک حصہ ان کو نقد ملتا جاتا ہے اور ایک حصہ ان کی طرف سے کمپنی کے سرمایہ میں شریک ہوتا جاتا ہے۔ اس طرح بکثرت محنت پیشہ کارکن اُس کمپنی یا کارپوریشن کی ملکیت میں حصہ دار بھی ہو گئے ہیں جس کے اندر وہ مزدوری یا ملازمت کر رہے ہیں بعض بڑے بڑے مشہور کارخانوں میں ۸۰ فی صدی اور ۹۰ فی صدی مزدور اور ملازم شریک ملکیت ہو چکے ہیں اور اقساط پر حصے خریدنے کی آسانیاں حاصل ہونے کی وجہ سے کارخانوں میں ان کی حصہ داری کا تناسب برابر بڑھتا جا رہا ہے۔

وہ خرابیاں جو اب تک نظام سرمایہ داری میں باقی ہیں

لیکن ان تمام تغیرات، ترمیمات اور اصلاحات کے باوجود ابھی تک نظام سرمایہ داری کے بنیادی عیوب جوں کے توں باقی ہیں۔

ابھی تک بے روزگاری کا استیصال نہیں ہو سکا ہے۔ بلکہ زمانۂ جنگ کے سوا دوسرے تمام حالات میں یہ ایک مستقل مرض ہے جو نظام سرمایہ داری کے تحت سوسائٹی کو لگا رہتا ہے۔ امریکہ جیسے ملک میں جس کی صنعت و حرفت اور پیداوار دولت آسمانِ عروج کو پہنچی ہوئی ہے، جنگی مشاغل کم ہوتے ہی ۳۲ لاکھ سے زیادہ آدمی بے کار ہو گئے، اپریل و مئی ۱۹۴۹ء کے درمیان ان کی تعداد بڑھتے بڑھتے ۳۵ لاکھ سے اوپر ہو گئی، اور جون میں ۴۰ لاکھ تک جا پہنچی۔ تجارت و صنعت کی گرم بازاری کا زمانہ ہو یا سرد بازاری کا زمانہ، بے روزگاری کم و بیش ہر حال میں نظام سرمایہ داری کی جزو لاینفک بنی رہتی ہے۔

ابھی تک وہ عجیب و غریب معمّا جوں کا توں بے حل پڑا ہوا ہے جس کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں کہ ایک طرف تو کروڑہا انسان ضروریات زندگی کے حاجت مند اور اسباب عیش کے خواہشمند موجود ہیں، بے حد و حساب قدرتی وسائل موجود ہیں جنہیں استعمال کر کے مزید اشیاء تیار کی جا سکتی ہیں، اور لاکھوں آدمی ایسے موجود ہیں جنہیں کام پر لگایا جا سکتا ہے، لیکن دوسری طرف نظام سرمایہ داری دنیا کی ضرورت اور امکانی کھپت سے بہت کم جو مال تیار کرتا ہے وہ بھی بازار میں پڑا رہ جاتا ہے کیونکہ لوگوں کے پاس اسکو خریدنے کے لئے روپیہ نہیں ہے،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور جب تھوڑا مال ہی نہیں نکلتا تو مزید آدمیوں کو کام پر لگانے اور قدرتی وسائل کو استعمال کرنے کی ہمت نہیں کی جا سکتی، اور جب آدمی کام پر ہی نہیں لگائے جاتے تو ان میں قوتِ خریداری پیدا ہونے کی کوئی صورت نہیں۔

یہی نہیں بلکہ ابھی تک نظام سرمایہ داری کا یہ عیب بھی علیٰ حالہٖ قائم ہے کہ ہر سال بہت بڑی مقدار میں تیار کیا ہوا مال اور پیدا کیا ہوا غلّہ اور پھل اور دوسرا سامان بازار میں لانے کے بجائے قصداً برباد کر دیا جاتا ہے، درآنحالیکہ کروڑوں آدمی ان اشیاء کے طالب موجود ہوتے ہیں۔ سرمایہ دار ان چیزوں کو غارت کر دینا اور اس غارت گری پر لاکھوں روپے صرف کر دینا زیادہ پسند کرتا ہے بہ نسبت اس کے کہ انہیں بازار میں لا کر ان کی قیمتیں گھٹائے اور انہیں سستے داموں حاجت مند انسانوں تک پہنچنے دے۔

ابھی تک نظام سرمایہ داری کا یہ عیب بھی اپنی جگہ قائم ہے کہ ریاست، سوسائٹی، مالدار طبقہ، غرض کوئی بھی اپنے آپ کو اُن لاکھوں کروڑوں آدمیوں کی کفالت اور دستگیری کا ذمہ دار نہیں سمجھتا جو قابلِ کار ہونے کے باوجود بے کار ہوں، یا ابھی قابلِ کار نہ ہوتے ہوں یا مستقل یا عارضی طور پر ناکارہ ہو گئے ہوں۔ اب بھی علاج کا مستحق وہی بیمار ہے جس کی جیب میں پیسہ ہو۔ اب بھی تعلیم و تربیت کا مستحق وہی یتیم ہے جس کا باپ انشورنس پالیسی چھوڑ مرا ہو۔ اب بھی حوادث میں گر کر وہی شخص اُٹھ سکتا ہے جو پہلے اچھے دن دیکھ چکا ہو اور اُن دنوں میں اس نے خود ہی برے وقت کے لئے سہارے کا سامان کر رکھا ہو۔ غرض ابھی تک مصیبت زدہ، حاجت مند، بے وسیلہ آدمی بجائے خود کسی کی بھی ذمہ داری نہیں ہے، یہ الگ بات ہے کہ کہیں اتفاقاً کسی کو کچھ مدد مل جائے۔

ابھی تک نظام سرمایہ داری کا یہ عیب بھی دور نہیں ہوا ہے کہ مصنوعی طور پر قیمتیں چڑھائی جاتی ہیں اور باقاعدہ منصوبے بنا بنا کر بعض اشیا کا قحط پیدا کیا جاتا ہے۔ غائب سودے اور تجارتی قمار بازی کے مختلف طریقے اب بھی اجتماعی معیشت کے مزاج کو شب و روز درہم برہم کرتے رہتے ہیں۔ لوگوں کو اب بھی کھلی چھٹی ملی ہوئی ہے کہ اگر وہ ایک بڑا سرمایہ فراہم کر سکتے ہیں تو اپنے ذاتی نفع کے لئے جو مال چاہیں اور جتنا چاہیں تیار کریں اور معاشرے پر اسکو ٹھونسنے کی جس طرح چاہیں کوشش کریں، خواہ معاشرے کو اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو، بلکہ اُس کے لئے وہ چیز مضر ہی کیوں نہ ہو۔ اب بھی یہ عجیب صورتِ حال رات دن مشاہدے میں آ رہی ہے کہ معاشرے کی نہایت اہم اور سخت ضرورتیں تو رکی پڑی ہیں مگر محنت اور سرمایہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عیش وعشرت کے سامانوں پر، شہواتِ نفس کے کھلونوں پر اور خوشحالی کے چونچلوں پر بے تحاشا صرف ہو رہا ہے۔
اب بھی صنعت اور تجارت کے بادشاہ اور مالیات کے شہنشاہ اپنی اغراض کے لیئے وہ کھلی اور چھپی ریشہ دوانیاں کیئے جا رہے ہیں جو بین الاقوامی کشمکش، رقابت اور جنگ کی موجب ہوتی رہتی ہیں۔

ابھی تک نظام سرمایہ داری میں معاشرے اور ریاست کی نکیل ساہوکار (بنیکر) کے ہاتھ میں ہے اور وہ ساری اجتماعی قدروں کو شرح سود کے معیار پر جانچ رہا ہے اور اسی محور پر ان کو گھما رہا ہے۔ یہ فیصلہ وہ کرتا ہے کہ سرمایہ کو کن کاموں پر خرچ ہونا چاہیئے اور کن پر نہ ہونا چاہیئے۔ اور اس فیصلے کے لیئے اس کے پاس معیار یہ نہیں ہے کہ معاشرے کے لیئے ضروری اور مفید کون سے کام ہیں بلکہ یہ ہے کہ بازار کی شرح سود کے برابر یا اس سے زائد نفع کن کاموں میں ہے۔ اس معیار کے لحاظ سے اگر آب رسانی کی بہ نسبت شراب رسانی زیادہ نفع آور ہو گی تو وہ بلا تامل عوام الناس کو صاف پانی کے لیئے ترستا چھوڑ کر عیاشوں کو شراب پلانے کی فکر میں لگ جائیگا۔

ابھی تک نظام سرمایہ داری کو وہ بیماری بھی لگی ہوئی ہے جسے "کاروبار کا چکر" Trade Cycle کہتے ہیں، جس میں ہر چند سال کی گرم بازاری کے بعد دنیا کی معیشت پر کساد بازاری کے دورے پڑتے رہتے ہیں۔ کاروبار کی دنیا پوری تیز رفتاری کے ساتھ مزے سے چل رہی ہوتی ہے کہ یکایک تجار محسوس کرتے ہیں کہ جو مال ان کے گوداموں میں آرہا ہے وہ مناسب رفتار سے نکل نہیں رہا۔ وہ ذرا فرمائشیں روکتے ہیں۔ صناع یہ حال دیکھکر ذرا مال کی تیاری سے ہاتھ کھینچتے ہیں۔ سرمایہ دار خطرے کی اس علامت کو بھانپتے ہی قرض سے ہاتھ کھینچ لیتا ہے اور پہلے کا دیا ہوا بھی واپس مانگنے لگتا ہے۔ کارخانے بند ہونے شروع ہوتے ہیں۔ بے روزگاری بڑھتی ہے قیمتیں گرنی شروع ہوتی ہیں۔ تاجر اور گاہک مزید قیمتیں گرنے کی امید پر فرمائش اور خریداری سے ہاتھ روکتے ہیں۔ چلتے ہوئے کارخانے بھی پیداوار کم کر دیتے ہیں سب بے روزگاری اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ حکومتیں آمدنی گھٹتی دیکھکر مصارف میں تخفیف کرنے لگتی ہیں۔ کساد بازاری میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح ہر قدم جو پیچھے ہٹتا ہے، کئی قدم اور پیچھے ہٹنے کا سبب بنتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب قطعی اور کلی دیوالہ کی سرحد قریب آجاتی ہے تو یکایک رُخ بدلتا ہے، آہستہ آہستہ چڑھاؤ شروع ہو جاتا ہے، اور پھر گرم بازاری کا دور آجاتا ہے۔ یہ چکر نظام سرمایہ داری کے لیئے ایک مستقل مرض بن چکا ہے جس کا ابھی تک کوئی علاج دریافت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں ہوا۔

یہ اور دوسرے بہت سے چھوٹے بڑے عیوب آج کی مقید اور اصلاح یافتہ سرمایہ داری میں بھی اسی طرح موجود ہیں جس طرح انیسویں صدی کی بے قید و بداطوار سرمایہ داری میں پائے جاتے تھے۔ یہ اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ جمہوریت نے اس نظام کے اصل اسبابِ خرابی کو سمجھ کر حکمت کے ساتھ انہیں دور کرنے کی کوئی تدبیر نہیں کی ہے، بلکہ جو کچھ ہوا ہے وہ صرف یہ ہے کہ جتنا جتنا محنت پیشہ عوام کا دباؤ پڑتا گیا ہے، یا اشتراکیت کا خطرہ بڑھتا گیا ہے، بورژوا طبقے اپنے طریقوں میں ایسی ترمیمات کرتے چلے گئے ہیں جن سے عوام کی شکایات اس حد تک ہلکی پڑ جائیں کہ اشتراکی لوگ ان سے فائدہ نہ اٹھا سکیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۵
تشخیص و علاج

پچھلے صفحات میں جو تاریخی بیان پیش کیا گیا ہے اس پر مجموعی نگاہ ڈالنے سے ایک عام ناظر کے سامنے کئی باتیں بالکل وضاحت کے ساتھ روشن ہو جائیں گی۔

سب سے پہلے تو وہ اُن مسائل اور اُن پیچیدگیوں کو صاف پہچان جائیگا جو مغرب کی تاریخ اور ہماری موجودہ اجتماعی زندگی میں مشترک ہیں۔ وہ دیکھے گا کہ یہاں نظام جاگیرداری بھی اپنی بہت سی خصوصیات کے ساتھ موجود ہے۔ اور جدید سرمایہ داری بھی اپنے بہت سے عیوب کے ساتھ جنم لے چکی ہے۔ کچھ بیماریاں ہم نے اپنے دورِ انحطاط سے میراث میں پائی ہیں۔ اور کچھ مغرب کے صنعتی انقلاب اور نظام سرمایہ داری کے جلو میں ہم تک پہنچی ہیں۔ البتہ فرق یہ ہے کہ یہاں کوئی پاپائیت اور کوئی کلیسائی نظام موجود نہیں ہے۔ نہ کوئی ایسا مذہبی طبقہ Priest Class موجود ہے جس کا صاحبِ فضل طبقوں سے گٹھ جوڑ ہو اور وہ خدا اور مذہب کا نام لے کر بے جا امتیازات اور زبردستی جمائے ہوئے حقوق کی حمایت کرے۔

پھر اس تاریخی مطالعہ سے ناظر کو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ ہمارے ہاں کے بوجھ بجھکڑ اپنی سوسائٹی کے مسائل اور پیچیدگیوں کو حل کرنے کے لئے آئے دن جو طُرفہ تجویزیں پیش کرتے رہتے ہیں اُن کا شجرۂ نسب کیا ہے۔ یہ جو ہم سنا کرتے ہیں کہ کوئی صاحب اجتماعی منصوبہ بندی" کی ضرورت پر زور دے رہے ہیں، اور کوئی دوسرے صاحب ملک کے معاشی نظام میں "انقلابی تبدیلیاں" چاہتے ہیں، اور کوئی تیسرے بزرگ فرماتے ہیں کہ زمین کو انفرادی ملکیت سے نکال کر "قومالیا" جائے[۱]، اور کسی طرف سے آواز آتی ہے کہ ساری کلیدی صنعتیں بھی "قومائی جائیں"۔ اور کوئی عطائیوں کی مجلس بڑے غور و خوض کے بعد یہ نسخۂ کیمیا لے کر آتی ہے کہ زمینداریوں کو ختم کر دیا جائے، یہ سب وہ نوادرِ حکمت ہیں جو مغرب کے اناڑیوں کی بیاض سے اڑائے گئے ہیں اور اب یہاں وہ سب تجربات، ہوا چاہتے ہیں جو روس میں، جرمنی و اٹلی میں اور امریکہ و انگلستان میں ہو چکے ہیں۔ مگر

---

[۱] یعنی قومی ملکیت بنایا جائے (Nationalise) کر دیا جائے۔ کوئی یہ گمان نہ کرے کہ میں اردو میں اس انگریزی طریقِ تصریف و استعمال کو جائز سمجھتا ہوں۔ دراصل میں نے طنزیہ اندازِ کلام کی مناسبت سے یہاں اس بدعت کا ارتکاب کیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس معاملہ میں بھی ہماری اور اُن کی مماثلت ایک فرق کے ساتھ ہے۔ وہاں کے اناڑی کم از کم مجتہد تو ہیں۔ لیکن یہاں جو حضرات مطب کھول بیٹھے ہیں وہ اناڑی پن کے ساتھ مقلد بھی ہیں۔ مغرب کے اناڑی نقصان ہوتے دیکھیں گے تو نسخے میں کچھ ردوبدل کرلیں گے۔ مگر یہاں مغرب سے ہی کسی ردوبدل کی اطلاع آجائے تو بات دوسری ہے ورنہ اگر مریض کی آخری ہچکی تک انشاء اللہ ایک ہی نسخہ پلاتا رہے گا۔

ایک اور بات جو مغربی ممالک کی تاریخ تمدن و تہذیب اور داستانِ افکار و اعمال میں آدمی کو نمایاں طور پر نظر آتی ہے وہ پیہم کشمکش نزاع اور جدال ہے۔ ایک گروہ زندگی کے میدان پر قابض ہو کر اخلاق کو، مذہب کو، قانون کو، رسم و رواج کو، اور تمدن کے سارے نظام کو ایک رُخ پر کھینچ لے جاتا ہے یہاں تک کہ دوسرے گروہوں کے ساتھ بے انصافی کی انتہا ہو جاتی ہے۔ پھر ان مظلوم گروہوں میں سے کوئی ایک اٹھ کر اس ظالم گروہ سے گتھ جاتا ہے اور اس کے غلط کے ساتھ اس کے صحیح پر بھی خط نسخ پھیرتا ہے اور فکر و عمل کے پورے نظام کو پہلی انتہا سے کھینچ کر دوسری انتہا کی طرف لے جاتا ہے یہاں تک کہ پھر بے انصافی حد کو پہنچ جاتی ہے۔ اس کے بعد شکوہ و شکایت سے گزر کر نوبت ایک تیسری بغاوت تک پہنچتی ہے۔ اور ضد اور ہٹ دھرمی کا طوفان پھر جھوٹ کے ساتھ سچ کو بھی بہالے جاتا ہے اور اگلوں سے بھی بڑھ کر ایک اور انتہا پسندانہ نظام قائم ہو جاتا ہے۔ اس طوفان کی تباہ کاریاں دیکھ کر اس کے مقابلے میں ایک جوابی طوفان اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور وہ بھی اپنے حریف سے کچھ کم انتہا پسند نہیں ہوتا۔ اس کھینچ تان کی وجہ سے مغرب کی تاریخ آدمی کو کچھ اس طرح سفر کرتی نظر آتی ہے جیسے ایک شرابی لڑکھڑاتا ہوا خط منحنی چل رہا ہو، نہ کہ ایک ہوشمند انسان سوِیّاً علیٰ صراطٍ مستقیم چلا جا رہا ہو۔ ہیگل اور مارکس بیچارے اس منظر کو دیکھ کر یہ سمجھ بیٹھے کہ انسانی تمدن کے ارتقاء کی فطری چال یہی ہے۔ لیکن درحقیقت یہ سب کچھ نتائج ہیں صرف ایک چیز کے اور وہ یہ ہے کہ اہلِ مغرب مدتہائے دراز سے بغیر ھدیً ولا کتابٍ منیر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ سینٹ پال کے توسط سے جو عیسائیت اُن کو پہنچی تھی اس کا رشتہ شریعت سے پہلے ہی توڑا جا چکا تھا۔ اس کے پاس مسیح علیہ السلام کے چند اخلاقی مواعظ کے سوا کوئی ایسی خدائی ہدایت سرے سے موجود ہی نہ تھی جس پر تمدن و سیاست و معیشت کا ایک وسیع نظام تعمیر کیا جا سکتا۔ بائبل کا پرانا عہد نامہ خود بھی ۲ فیصدی خدائی ہدایت کے ساتھ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۸۰ فیصدی انسانی کلام کی آمیزش اپنے اندر لئے ہوئے تھا۔ اس لئے اگر بعد میں انہوں نے نیم عقیدت اور نیم بے عقیدگی کے ساتھ اسکی طرف رجوع کیا بھی تو اس سے کچھ بہت زیادہ رہنمائی نہ مل سکی۔ اسلام عین اس زمانے میں یورپ کے سامنے آچکا تھا جب کہ مغربی رومن امپائر کا نظام درہم برہم ہوئے تھوڑی ہی مدت گزری تھی اور دورِ متوسط کی تاریکی کا ابھی آغاز ہی ہوا تھا۔ لیکن جس یورپ نے دینِ مسیحی کو اس شرط پر قبول کیا تھا کہ شریعت اس کے ساتھ نہ ہو، وہ بھلا اُس اسلام کی طرف حصولِ ہدایت کے لئے کیسے توجہ کرتا جو شریعت کے بغیر نرا دین وایمان پیش کرنے کے لئے کسی طرح تیار ہی نہ تھا۔ کچھ تو اس وجہ سے، اور کچھ پادریوں کے پھیلائے ہوئے تعصبات کی وجہ سے، یورپ نے اسلام سے بھی کوئی روشنی حاصل نہ کی۔ اب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ اہل مغرب خود ہی اپنی عقل سے اپنے لئے نظام زندگی بناتے۔ چنانچہ یہی انہوں نے کیا۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ انسان خالص عقلی فیصلے نہیں کر سکتا۔ اُس کی عقل کے ساتھ خواہش، کا گمراہ کن شیطان بھی لگا ہوا ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ سارے انسان ایک ساتھ مل کر کوئی نظام زندگی وضع نہیں کیا کرتے۔ کچھ بیدار مغز لوگ ہی ایک نظام تجویز کرتے ہیں اور وہ علم وعقل رکھنے کے ساتھ لامحالہ کچھ اپنے ذاتی وطبقاتی تعصبات بھی رکھتے ہیں جن کی وجہ سے ان کا نظام انہی لوگوں کو اپیل کرتا ہے جو ان کے ساتھ ان کے تعصبات میں شریک ہوں۔ یہی اسباب ہیں جن کی بناء پر یورپ میں وقتاً فوقتاً جتنے نظام زندگی بھی بنتے رہے وہ سب غیر متوازن تھے، اور اس عدم توازن کا لازمی نتیجہ یہی ہونا تھا کہ وہاں ایک پیہم کشمکش اور کھینچ تان جاری رہتی۔

سوال یہ ہے کہ کیا فی الواقع ہم بھی اس دنیا میں بغیر ھدیً ولا کتابٍ منیر ہی ہیں؟ کیا ہمارے لئے بھی اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ قدیم ہندوانہ جاہلیت، اور دورِ متوسط کے مغل نظام اور دورِ حاضر کے فرنگی تمدن نے مل جل کر جن مسائل سے ہم کو دوچار کر دیا ہے اُن کے حل کی وہی صورتیں اختیار کریں جو اشتراکیت، نازیت، فاشیت اور سرمایہ داری نے مغرب میں اختیار کی ہیں؟ کیا ہمارے پاس بھی کوئی ایسی روشنی موجود نہیں ہے جس کی مدد سے ایک متوازن نظام بنایا جا سکتا ہو؟ ——— جو شخص اسلام کو جانتا ہو وہ ان سوالات کا جواب اثبات میں نہیں دے سکتا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اصلی الجھن اسلام کے اصول پر ہم ان مسائل کو کس طرح حل کر سکتے ہیں۔ اسکو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ایک مرتبہ واضح طور پر اس اصلی الجھن کو سمجھ لیا جائے جس سے اس وقت دنیا دوچار ہے اور ہم کو بھی دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔ مختصر الفاظ میں وہ الجھن یہ ہے کہ

اگر ہم بے قید معیشت کے اصول اختیار کرتے ہیں (جن کی رو سے ہر شخص کو بے روک ٹوک یہ موقع حاصل رہتا ہے کہ جس قدر ذرائع پیداوار کو چاہے اپنے قبضے میں لائے اور جس طرح چاہے اپنے نفع کے لئے سعی و جہد کرے۔ نیز جن کی رو سے سوسائٹی میں عدل و توازن قائم کرنے کے لئے صرف مقابلہ و مسابقت اور کسر و انکسار کے خود رو قوانین ہی پر اعتماد کر لیا جاتا ہے) تو اس سے سرمایہ داری نظام کی وہ خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، اور ہماری سوسائٹی کی حد تک جاگیرداری نظام کی بھی وہ بہت سی خرابیاں باقی رہ جاتی ہیں، جن کا ذکر اس سے پہلے ہم "نظام جاگیرداری" اور "جدید نظام سرمایہ داری" کے زیر عنوان کر چکے ہیں۔

اور اگر ہم انفرادی ملکیت کے طریقے کو ختم کر کے تمام ذرائع پیداوار پر اجتماعی قبضہ و تصرف قائم کر دیتے ہیں، تو بلا شبہ مذکورہ بالا خرابیوں کا تو بڑی حد تک تدارک ہو جاتا ہے، مگر اول تو یہ بنیادی تغیر ہی جان و مال کی اس بے دریغ بربادی اور مذہب و اخلاق سے اس کھلی بغاوت کے بغیر نہیں ہو سکتا جس کی مثال روس کے اشتراکی انقلاب میں ہم کو ملتی ہے۔ دوسرے اگر بالفرض یہ تغیر پُرامن جمہوری طریقوں سے ہو بھی جائے تو اجتماعی ملکیت کا نظام بہر حال انفرادی آزادی کو قطعی ختم کر دیتا ہے۔ جمہوری طریقوں سے سوشلزم قائم کرنا درحقیقت جمہوریت کے ذریعہ سے جمہوریت کو ختم کرنا ہے۔ اس لئے کہ جمہوریت تو اس کے بغیر چل ہی نہیں سکتی کہ سوسائٹی میں کم از کم ایک بہت بڑی اکثریت آزاد پیشہ ور لوگوں کی موجود رہے۔ لیکن سوشلزم اس کے برعکس آزاد پیشوں کو ختم کر دیتا ہے۔ معیشت کا جو شعبہ بھی اجتماعی انتظام میں لیا جائے گا۔ اس کے تمام کارکن ایسے ہی ہو جائیں گے جیسے سرکاری ملازم۔ ملازمت پیشہ طبقہ میں جتنی کچھ آزادی رائے اور آزادی عمل پائی جاتی ہے، ہر شخص اسکو جانتا ہے۔ یہ طریق کار جتنا جتنا معیشت میں پھیلتا چلا جائے گا، آزادی فکر، آزادی گفتار، آزادی اجتماع، آزادی تحریر، اور آزادی کار کی سرحدیں سکڑتی چلی جائیں گی۔ یہاں تک کہ جس روز پوری معیشت پورے اجتماعی انتظام میں چلی جائے گی اسی روز ملک کی پوری آبادی بالکل سرکاری ملازمین میں تبدیل ہو جائے گی۔ اس طرح کے نظام کی عین فطرت یہی ہے

© rasailojaraid.com

کہ جو گروہ ایک مرتبہ اُس میں برسرِ اقتدار آجائے گا، وہ پھر ہٹایا نہ جا سکیگا۔

اور اگر ہم انفرادی ملکیت کے نظام کو مٹانے کے بجائے صرف اس پر ایک مضبوط سرکاری تسلّط (State Control) قائم کر دیتے ہیں اور پوری قومی معیشت کو ایک مرکزی منصوبہ بندی کے مطابق چلاتے ہیں، جیساکہ فاشیت اور نازیت نے کیا، تب بھی نظام سرمایہ داری کی بہت سی خرابیوں کا مداوا تو ہو جاتا ہے، مگر انفرادی آزادی کے لئے آہنی ضابطہ بندی بھی مہلک ثابت ہوتی ہے۔ اس کے نتائج عملاً وہی کچھ ہیں جو سوشلزم کے نتائج ہیں۔

اور اگر ہم نظام سرمایہ داری کو اسکی اصل بنیادوں پر قائم رکھتے ہوئے اس کے اندر اس طرح کی اصلاحات کرتے ہیں جیسی اب تک امریکہ اور انگلستان وغیرہ ممالک میں ہوئی ہیں تو ان سے جمہوریت اور انفرادی آزادی تو برقرار رہتی ہے مگر اُن بڑی اور اصلی خرابیوں میں سے کوئی ایک بھی دور نہیں ہوتی جن کی بدولت نظام سرمایہ داری دنیا کے لئے ایک لعنت اور مصیبت بن چکا ہے۔

گویا ایک طرف کنواں ہے تو دوسری طرف کھائی۔ اجتماعی فلاح کا انتظام کیا جاتا ہے تو افراد کی آزادی ختم ہو جاتی ہے۔ افراد کی آزادی کو بچایا جاتا ہے تو اجتماعی فلاح غارت ہو جاتی ہے۔ ایسا کوئی نظامِ زندگی اس وقت تک دنیا نہیں پا سکی ہے جس میں صنعتی انقلاب تو اپنی تمام برکات کے ساتھ جوں کا توں چلتا اور بڑھتا رہے اور پھر انفرادی آزادی اور اجتماعی فلاح دونوں بیک وقت پورے اعتدال کے ساتھ نبھ جائیں۔ اسی قسم کے ایک نظام کی دریافت پر دنیا کا مستقبل معلق ہے۔ اگر وہ نہ ملا تو صنعتی انقلاب ہی کے پستول سے انسان خودکشی کر لیگا اور اگر وہ مل گیا تو جو ملک بھی اس کا ایک کامیاب نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر دے گا وہی دنیا کا امام بن جائے گا۔

اسلامی حل آیئے اب ہم دیکھیں کہ اسلام جو اصول ہم کو دیتا ہے ان کی بنیاد پر یہ پیچیدگی کس طرح حل کی جا سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے چند بنیادی حقیقتوں کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے۔

چند بنیادی حقیقتیں اولین بات جس کو جان لینا اسلامی نظام تمدن کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے، یہ ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے اصل اہمیت فرد کی ہے نہ کہ جماعت یا قوم یا معاشرے کی۔ فرد جماعت کے لئے نہیں ہے بلکہ جماعت فرد کے لئے ہے۔ خدا کے سامنے کوئی جماعت یا قوم یا معاشرہ اپنی مجموعی حیثیت میں ذمہ دار نہیں ہے بلکہ ایک ایک شخص

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فرداً فرداً اپنی ذاتی حیثیت میں ذمہ دار ہے، اور اس ذاتی ذمہ داری و جواب دہی پر ہی انسان کی ساری اخلاقی قدر و قیمت کا مدار ہے۔ اجتماعی زندگی سے اصل مقصود مجموعی خوشحالی نہیں بلکہ انفرادی فلاح ہے اور ایک نظام جماعت کے صالح یا فاسد ہونے کا حقیقی معیار یہی ہے کہ وہ اپنے افراد کی شخصیتوں کے پھلنے پھولنے میں اور ان کی ذاتی صلاحیتوں کے پوری طرح بروئے کار آنے میں کس حد تک مددگار (معاون) یا مانع و مزاحم ہے۔ اس بنا پر اسلام اجتماعی تنظیم کی کسی ایسی صورت کو، یا جماعتی فلاح کی خاطر کسی ایسی تدبیر کو پسند نہیں کر سکتا جس سے افراد جماعتی شکنجے میں اس حد تک کس جاتے ہوں کہ ان کی مستقل شخصیت دب جائے اور بہت سے آدمی چند آدمیوں کے ہاتھوں میں بے روح آلات بن کر رہ جائیں۔

انسان کی انفرادیت کا صحیح نشو ونما اور اس کی شخصیت کا پورا پورا ابھار بغیر اس کے ممکن نہیں ہے کہ اسے فکر و عمل کی آزادی حاصل ہو۔ اس غرض کے لئے صرف آزادی رائے، آزادی تحریر و تقریر، آزادیٔ سعی اور آزادیٔ اجتماع ہی ضروری نہیں ہے بلکہ آزادی معاش بھی اتنی ہی ضروری ہے۔ یہ ایک فطری حقیقت ہے جس کو ثابت کرنے کے لئے کسی لمبی چوڑی بحث کی حاجت نہیں۔ صرف عقلِ عام ہی اس کا ادراک کرنے کے لئے کافی ہے۔ ایک راہ چلتا آدمی بھی اس بات کو خوب جانتا ہے کہ جس شخص کی معاش آزاد نہیں ہے اسے درحقیقت کوئی آزادی بھی حاصل نہیں ہے، نہ رائے کی، نہ زبان اور قلم کی اور نہ سعی و عمل کی۔ لہٰذا انسانیت کے لئے اگر کوئی معاشرہ سب سے بہتر ہو سکتا ہے تو صرف وہ جس میں ایک بندۂ خدا کے لئے اس امر کے کافی مواقع موجود ہوں کہ اپنے ضمیر کو فروخت کئے بغیر اپنے ہاتھ پاؤں کی محنت سے دو وقت کی روٹی پیدا کر سکے۔ اگرچہ صنعتی انقلاب کے دور میں اس کے مواقع بہت کم رہ گئے ہیں۔ بڑے صنعتی اور تجارتی اداروں نے اور بڑے پیمانے کی کاشت نے منفرد دستکاروں اور کاریگروں کے لئے اور چھوٹے چھوٹے سوداگروں اور کاشتکاروں کے لئے زندگی کا میدان اس قدر تنگ کر دیا ہے کہ وہ اُن کے مقابلے میں اپنے آزاد پیشے کامیابی کے ساتھ نہیں چلا سکتے۔ تاہم جس نظام میں ذرائع پیدا وار کی انفرادی ملکیت برقرار ہو اس میں باوسیلہ اشخاص کے لئے اس امر کا اچھا خاصا موقع باقی رہتا ہے کہ خود اپنے آزاد صنعتی یا تجارتی یا زراعتی ادارے قائم کریں۔ اور بے وسیلہ کارکنوں کے لئے بھی کم از کم اتنی گنجائش تو ضرور ہی باقی رہ جاتی ہے کہ ایک شخص یا ادارے کی نوکری و مزدوری ان کے ضمیر پر بار ہو تو دوسرے دروازے پر جا کھڑے ہوں۔ مگر جہاں تمام یا بیشتر ذرائع پیداوار کو اجتماعی ملکیت بنا دیا جائے، یا جہاں شخصی ملکیتوں کو باقی رکھا جائے، مگر نا جائز

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وفاشی طریقے پر سارے معاشی کاروبار کو ریاست کے مکمل تسلط میں ایک ہمہ گیر منصوبہ بندی کے تحت چلایا جائے، ایسی جگہ تو افراد کی معاشی آزادی کس طرح باقی رہ ہی نہیں سکتی اور اس کے خاتمہ کے ساتھ ذہنی، معاشرتی اور سیاسی آزادی کا جنازہ آپ سے آپ نکل جاتا ہے۔ لہٰذا جو نظام زندگی انسان کی انفرادیت کو عزیز رکھتا ہو اور انسانی شخصیت کے ابھار کو مقصدی اہمیت دیتا ہو اس کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ اجتماعی فلاح کی ایسی تمام اسکیموں کو اصولی طور پر اور قطعی وحتمی طور پر رد کر دے جن میں یہ تجویز کیا گیا ہو کہ زمینوں اور کارخانوں اور تجارتوں کو قومی ملکیت بنا لیا جائے، یا ان پر ریاست کا تازیانہ تسلط قائم کر کے ایک مرکزی منصوبہ بندی کے تحت ساری معیشت کی مشین گھمانی شروع کر دی جائے۔

یہی پوزیشن اس معاملہ میں اسلام نے اختیار کی ہے۔ وہ کمیونزم کا تو ایک اور وجہ سے بھی مخالف ہے، اور وہ یہ ہے کہ کمیونسٹ حضرات ذرائع پیداوار کو انفرادی ملکیت سے نکال کر قومی ملکیت بنانے کے لئے مار دھاڑ اور زبردستی سے کام لیتے ہیں۔ لیکن اگر اس سکیم کو نافذ کرنے کے لئے یہ غاصبانہ ظلم وستم اور ظالمانہ سلب ونہب کا طریقہ نہ بھی اختیار کیا جائے اور اس کے بجائے ارتقائی سوشلزم کے وہ طریقے استعمال کیئے جائیں جن سے زمینوں اور صنعتوں اور تجارتوں کو قوانین کے ذریعہ سے بتدریج قومی ملکیت میں تبدیل کیا جاتا ہے، تب بھی اسلام کا مزاج اسکو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے، کیونکہ اس طرح کا نظام اپنی عین فطرت ہی کے لحاظ سے انسانیت کُش واقع ہوا ہے۔ علیٰ ہٰذالقیاس نازی اور فاشی طرز کی ضابطہ بندیاں اور منصوبہ بندیاں بھی اسلام کی طبیعت کے بالکل خلاف ہیں، اس لیئے کہ ان کے اجتماعی فوائد خواہ کچھ بھی ہوں، لیکن انسانی تشخص کے ظہور اور نشو وارتقا اور تکمیل میں وہ بہرحال مانع ہیں۔

اس معاملہ کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ اسلام جو ذہنیت اور اخلاقی نقطۂ نظر انسان کے اندر پیدا کرتا ہے اس کا سنگ بنیاد ہے خدا کا خوف اور خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری کا احساس۔ یہ دونوں اوصاف جس شخص یا گروہ میں موجود ہوں اُس پر اگر اجتماعی معاملات کی سربراہی کا بار ڈال دیا جائے تو وہ ایسا ایک نظام قائم کرنے اور چلانے کے لئے خود ہی تیار نہیں ہو سکتا جس میں اپنے ذاتی بوجھ کے ساتھ ساتھ لاکھوں کروڑوں انسانوں کی انفرادی ذمّہ داریوں کا بوجھ بھی وہ اُن کے سر سے اتار کر خود اپنے سر پر لاد لے۔ یہی وہ بات ہے جو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینے میں ایک قحط کے موقع پر فرمائی تھی جب آپ سے عرض کیا گیا کہ قیمتیں بہت چڑھ رہی ہیں، آپ سرکاری طور پر اشیاء کے نرخ مقرر فرما دیجیے، تو آپ نے ایسا کرنے سے انکار فرما دیا اور عذر یہ بیان کیا کہ انی ارید ان القی اللہ ولیس لاحد عندی مظلمۃ یطلبنی بھا، "میں اپنے خدا سے اس طرح ملنا چاہتا ہوں کہ میرے خلاف کوئی ایک شخص بھی ظلم کی شکایت کرنے والا نہ ہو"[1]

مزید برآں اسلام ہر معاملہ میں انسان کو فطری حالت سے قریب تر رکھنا چاہتا ہے اور زندگی کے کسی پہلو میں بھی مصنوعی پن کو پسند نہیں کرتا۔ انسانی معیشت کے لئے فطری حالت یہی ہے کہ خدا نے رزق کے جو ذرائع اس زمین پر پیدا کیے ہیں ان کو افراد اپنے قبضے میں لائیں، فرد فرد اور گروہ گروہ بن کر ان پر تصرف اور ان سے استفادہ کریں اور اپنے آپس میں اشیاء اور خدمات کا آزادانہ لین دین کرتے رہیں۔ غیر معلوم مدت سے اس طرز پر انسانی معیشت کا کارخانہ چلتا آرہا ہے اور یہ گنجائش کچھ اس فطری نظام ہی میں نکل سکتی ہے کہ ایک آدمی معاشرے کے اندر رہتے ہوئے بھی اپنی معیشت میں آزاد اور اپنی زندگی میں مستقل ہو سکے۔ رہے وہ بے شمار چھوٹے بڑے "ازم" جو نیم پختہ ذہن کے لوگ آئے دن تصنیف کرتے رہتے ہیں، تو وہ سب ایک نہ ایک طرح کا مصنوعی نظام تجویز کرتے ہیں جس میں آدمی ایک مستقل ذی روح انسان ذی شعور شخصیت اور ایک مقصدی اہمیت رکھنے والی ہستی کے بجائے محض اجتماعی مشین کا ایک پرزہ بن کر رہ جاتا ہے۔

مصنوعی طریقوں کی طرح اسلام انقلابی طریقوں کو بھی پسند نہیں کرتا۔ زمانہ جاہلیت میں اہل عرب کسب معاش کے بکثرت ایسے ذرائع استعمال کرتے تھے جن کو اسلام نے بعد میں آکر حرام اور سخت قابل نفرت ٹھہرایا۔ مگر پہلے کی جو املاک چلی آرہی تھیں ان کے متعلق اسلام نے یہ جھگڑا نہیں اٹھایا کہ جن جن لوگوں نے حرام خوری

---

[1] اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ نے گرانی کو اس کے حال پر چھوڑ دیا اور اس کے علاج کی طرف توجہ نہیں فرمائی۔ دراصل جس چیز سے آپ نے انکار کیا تھا وہ یہ تھی کہ حکومت اپنی مصنوعی مداخلت سے قیمتوں کے پیچیدہ نظام کو درہم برہم کرے۔ اس طریقہ کو چھوڑ کر آپ نے اپنی پوری قوت کاروباری لوگوں کی اخلاقی اصلاح پر صرف فرمائی اور مسلسل تبلیغ سے یہ بات ان کے ذہن نشین کی کہ جان بوجھ کر قیمتیں چڑھانا ایک بہت بڑا گناہ ہے۔ یہ تبلیغ خوب کارگر ثابت ہوئی اور کچھ زیادہ دیر نہ گذری تھی کہ قیمتیں اعتدال پر آنی شروع ہو گئیں۔

© rasailojaraid.com

کے ذریعہ سے دولت کمائی تھی اب ان کی املاک ضبط ہونی چاہئیں۔ حتیٰ کہ سود خواروں، اور قحبہ گری کا پیشہ کرنے والوں اور ڈاکہ مارنے والوں تک کے پچھلے اعمال پر گرفت نہ کی گئی جس کے قبضے میں جو کچھ تھا، اسلام کے دیوانی قانون نے اس کے حقوق ملکیت تسلیم کر لیئے، آئندہ کے لئے حرام طریقوں کو بند کر دیا گیا، اور [illegible] قانونِ میراث بتدریج تحلیل کرتا چلا گیا۔

تفصیلات مذکورۂ بالا حقائق کو ذہن نشین کرنے کے بعد اب ذرا چند صفحات پیچھے پلٹ کر ایک نظر پھر اُن مباحث پر ڈال لیجئے جو اس سے پہلے "جدید نظام سرمایہ داری" کے باب میں آپ کی نگاہ سے گذر چکے ہیں۔ وہاں "بے قید معیشت" کے اصولوں کی جو تشریح ہم نے کی ہے، آپ خود محسوس کریں گے کہ انسانی معیشت کے فطری اصول درحقیقت وہی ہیں، بشرطیکہ ان سے وہ مبالغہ الگ کر دیا جائے جو اہل مغرب کے بورژوا طبقہ نے اپنی خود غرضی و انتہا پسندی کی بنا پر ان میں شامل کر دیا تھا۔ پھر وہاں "خرابی کے اسباب" جو ہم نے بیان کیئے ہیں، آپ تسلیم کریں گے کہ درحقیقت وہی خرابی کے اصل اسباب ہیں جنھیں اگر دور کر دیا جائے تو انسانی معیشت کا نظام اپنی فطری بنیادوں پر بہت اچھی طرح چل سکتا ہے بغیر اس کے کہ اس میں سرمایہ داری نظام کی برائیاں پیدا ہوں اور ان کے علاج کی مصنوعی تدبیریں اختیار کرنی پڑیں۔

ٹھیک یہی طریق کار ہے جو اسلام نے اختیار کیا ہے۔ وہ "بے قید معیشت" کو "آزاد معیشت" میں تبدیل کر دیتا ہے، اور اس آزادی کو اُسی طرح چند حدود کا پابند بناتا ہے جس طرح تمدن و معاشرت کے تمام دوسرے شعبوں میں انسانی آزادی کو محدود کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ وہ ایسے تمام دروازے بند کر دیتا ہے جن سے آزاد معیشت میں ظالمانہ سرمایہ داری کی خصوصیات اور اثرات و نتائج پیدا ہونے کا امکان ہو۔ آیئے اب ہم ذرا تفصیل کے ساتھ دیکھیں کہ اسلام کے ان اصولوں پر معیشت کا کیا نقشہ بنتا ہے۔

(۱) اسلام تمام دوسری ملکیتوں کی طرح زمین پر بھی انسان کی شخصی ملکیت تسلیم کرتا ہے۔ جتنی قانونی شکلیں ایک چیز پر کسی شخص کی ملکیت قائم و ثابت ہونے کے لئے مقرر ہیں اُن ساری شکلوں کے مطابق زمین بھی اُسی طرح ایک آدمی کی ملکیت ہو سکتی ہے جس طرح کوئی دوسری چیز۔ اس کے لئے کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ ایک گز مربع سے لے کر ہزارہا ایکڑ تک، خواہ کتنی ہی زمین ہو، اگر کسی قانونی صورت سے آدمی کی ملک میں آئی ہے

© rasailojaraid.com

تو بہر حال وہ اسکی جائز ملک ہے۔ اس کے لئے خود کاشت کرنے کی قید بھی نہیں ہے۔ جس طرح مکان اور فرنیچر کرائے پر دیا جا سکتا ہے، سواری کرائے پر چلائی جا سکتی ہے، اسی طرح زمین بھی کرائے پر دی جا سکتی ہے۔ بلا کرایہ کوئی شخص کسی کو دے تو یہ صدقہ ہے۔ مگر کرایہ و لگان یا بٹائی پر معاملہ طے کرے تو یہ ویسا ہی ایک جائز فعل ہے جیسے تجارت میں حصہ داری۔ زمینی "نظام جاگیرداری" کی وہ خرابیاں جو ہمارے ہاں پائی جاتی ہیں، تو نہ وہ خالص زمینداری کی پیداوار ہیں اور نہ ان کا علاج یہ ہے کہ سرے سے زمین کی شخصی ملکیت ہی اڑا دی جائے، یا اس پر وہ مصنوعی حد بندیاں عائد کی جائیں جو "زرعی اصلاحات" کے نام سے آج کل کے نیم حکیم تجویز کر رہے ہیں۔ بلکہ اسلامی اصول پر ان کا علاج دراصل یہ ہے کہ:

زمین کی خرید و فروخت پر سے تمام پابندیاں اٹھا دی جائیں اور اس کا لین دین بالکل اسی طرح کھلے طور پر ہو جس طرح دنیا کی دوسری چیزوں کا ہوتا ہے۔

زراعت پیشہ اور غیر زراعت پیشہ طبقوں کی مستقل تفریق ہر شکل اور ہر حیثیت سے قطعی ختم کر دی جائے۔

وہ مخصوص امتیازی حقوق بھی از روئے قانون منسوخ کر دیئے جائیں جو ہماری دیہاتی زندگی میں مالکان زمین کو حاصل ہیں۔

مالک زمین اور کاشتکار کے درمیان حقوق و فرائض از روئے قانون مقرر کر دیئے جائیں اور ان مقرر حقوق کے ماسوا کسی دوسری قسم کے حقوق مالکان زمین کو اپنے مزارعین پر حاصل نہ ہوں۔

میراث کے معاملہ میں تمام رسوم جاہلیت کا خاتمہ کر دیا جائے۔ زمینداروں کی موجودہ املاک شرعی طریقے پر ان کے زندہ وارثوں کے درمیان تقسیم کر دی جائیں۔ اور آئندہ کے لئے اسلام کا قانون میراث ٹھیک ٹھیک نافذ کیا جائے۔

زمین بیکار ڈال رکھنے پر پابندی عائد کر دی جائے۔ مثلاً یہ کہ جو زمینیں حکومت نے آبادکاری کے لئے دی ہوں وہ اگر تین سال سے زیادہ مدت تک بیکار ڈال رکھی جائیں گی تو عطیہ منسوخ ہو جائے گا۔ اور جو ملوکہ زمینیں افتادہ چھوڑ رکھی جائیں گی ان پر ایک خاص مدت کے بعد ٹیکس لگا دیا جائے گا۔

زمینداروں اور کاشتکاروں سے ان کی پیداوار کا ایک مخصوص حصہ ان مقاصد کے لئے الگ لے لیا جائے

© rasailojaraid.com

جن کا ذکر آگے نمبر (۴) میں آرہا ہے۔

نئے سائنٹفک طریقوں سے اگر بڑے پیمانے کی کاشت کرنی ہو تو اس کے لئے امداد باہمی کے ایسے ادارے قائم کئے جائیں جن میں چھوٹے چھوٹے مالکان زمین اپنے مالکانہ حقوق قائم رکھتے ہوئے آپس کی رضامندی سے اپنی املاک کو ایک بڑے کھیت میں تبدیل کریں اور مل جل کر ایک انجمن کی طرح اس کے سارے کاروبار چلائیں۔

کیا ان اصلاحات کے بعد زمینداری میں کوئی ایسی خرابی باقی رہ جاتی ہے جس کی معقولیت کے ساتھ نشان دہی کی جاسکتی ہو[1] ؟

(۱) اسلام اشیاء استعمال اور ذرائع پیداوار کے درمیان اس طرح کا کوئی فرق تسلیم نہیں کرتا کہ ایک پر شخصی ملکیت جائز ہو اور دوسرے پر نہ ہو۔ اس کے نزدیک یہ بات بالکل جائز ہے کہ ایک آدمی دوسرے لوگوں کے لئے اُن کی ضروریات زندگی میں سے کوئی چیز تیار یا فراہم کرے اور انہی کے ہاتھ فروخت کرے۔ یہ کام وہ خود اپنے ہاتھ سے بھی کرسکتا ہے اور دوسروں سے اجرت پر لے بھی سکتا ہے۔ ایسے سامان کی تیاری یا فراہمی میں وہ جس مواد خام کو، جن آلات کو اور جس کارگاہ کو استعمال کرے، ان سب کا وہ مالک ہوسکتا ہے۔ یہ سب کچھ جس طرح صنعتی انقلاب کے دور سے پہلے جائز تھا اسی طرح اس دور میں بھی جائز ہے۔ مگر بے قید صنعت و تجارت نہ پہلے صحیح تھی اور نہ اب صحیح ہے۔ اسلامی اصول پر اسے حسب ذیل قواعد کا پابند بنانا ضروری تھا اور ہے۔

کسی ایسی فنی ایجاد کو، جو انسانی طاقت کی جگہ مشینی طاقت سے کام لیتی ہو، صنعت و حرفت اور کاروبار میں استعمال کرنے کی اس وقت تک اجازت نہ دی جائے جب تک اس امر کا اچھی طرح جائزہ نہ لے لیا جائے کہ وہ کتنے انسانوں کی روزی پر اثر ڈالے گی، اور یہ اطمینان نہ کرلیا جائے کہ ان متاثر ہونے والے لوگوں کی معیشت کا کیا بندوبست ہوگا۔

اجیروں اور مستاجروں کے درمیان حقوق اور فرائض اور شرائط کار کا تفصیلی تعین تو بہرحال فریقین ہی کی باہمی قرارداد پر چھوڑا جائیگا مگر ریاست اس معاملہ میں انصاف کے ساتھ چند اصول لازماً طے کردے۔ مثلاً ایک کارکن

---

[1] زمین اور اس کے انتظام کے بارے میں اسلامی احکام کا ایک مجموعہ انشاء اللہ عنقریب مرتب کردیا جائے گا جس سے اس اجمال کی تفصیل معلوم ہوجائے گی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے لئے کم سے کم تنخواہ یا مزدوری کا معیار، زیادہ سے زیادہ اوقات کار کی حد، بیماری کی حالت میں علاج کے اور جسمانی نقصان کی صورت میں تلافی کے اور ناقابل کار ہو جانے کی حالت میں پنشن کے کم سے کم حقوق ملا ہی لینے، دوسرے امور میں اجیر و مستاجر کی نزاعات کا تصفیہ حکومت اپنے ذمہ لے اور اس کے لئے باہمی مفاہمت، ثالثی، اور عدالت کا ایک ایسا ضابطہ مقرر کر دے جس کی وجہ سے ہڑتالوں اور در بندیوں (Lockouts) کی نوبت ہی نہ آنے پائے۔

کاروبار میں احتکار[1] (Hoarding)، سٹے (Speculation)، تجارتی قمار بازی، اور ایسے ہی دوسرے افعال کی قطعی ممانعت کر دی جائے، اور ان تمام طریقوں کو از روئے قانون بند کیا جائے جن سے قیمتوں پر ایک مصنوعی آماس چڑھتا ہے[2]۔

پیداوار کو قصداً برباد کرنا جرم قرار دیا جائے۔

صنعت اور تجارت کا ہر شعبہ حتی الامکان مسابقت کے لئے کھلا رہے اور اجارہ داریوں سے کسی شخص یا گروہ کو ایسے امتیازی حقوق دل جائیں جو دوسرے لوگوں کو حاصل نہ ہوں۔

ایسی صنعتوں اور تجارتوں کی اجازت نہ ہو جو عامۃ الناس کے اخلاق یا صحت پر برا اثر ڈالتی ہوں۔ اس طرح کی کوئی چیز اگر کسی پہلو سے ضروری ہو تو اس کی صنعت و تجارت پر تابحد ضرورت پابندیاں عاید کی جائیں۔

حکومت نازی طریقہ پر صنعت و تجارت کو بالکل اپنے تسلط (Control) میں تو نہ لے، مگر رہنمائی اور توفیق (Co-ordination) کی خدمت لازماً انجام دیتی رہے تاکہ ملک کی صنعت و تجارت غلط راستوں پر بھی نہ جانے پائے، اور معاشی زندگی کے مختلف شعبوں میں ہم آہنگی بھی پیدا ہو سکے۔

اسلامی قانون میراث کے ذریعہ سے زمینداروں کی طرح صناعوں اور کاروباری لوگوں کی سمٹی ہوئی دولت

---

[1] یعنی اشیاء ضرورت کے ذخائر کو سمیٹ سمیٹ کر فروخت سے روک رکھنا تاکہ ان کی قیمتیں چڑھ جائیں۔

[2] اسلامی شریعت کا تجارتی قانون درحقیقت معاشی زندگی کی اصلاح کا ایک بڑا اہم باب ہے جس سے دنیا نے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی، بلکہ خود مسلمانوں نے بھی اس سے مجرمانہ غفلت برتی ہے۔ یہاں اس قانون کی تفصیلات بیان کرنے کا موقع نہیں ہے۔ انشاء اللہ عنقریب ایک مستقل رسالہ خاص اس موضوع پر مرتب کر دیا جائے گا۔ اس مقام پر صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ کاروبار کے ان غلط طریقوں کو از روئے قانون بند ہونا چاہیئے جو اجتماعی مفاد کے لئے نقصان دہ ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بھی پیہم تقسیم ہوتی رہے تاکہ مستقل دولت مند طبقے نہ بننے پائیں۔

اہل زراعت کی طرح تاجروں اور صناعوں اور کاروباری لوگوں سے بھی ان کی آمدنیوں کا ایک حصہ اُن مقاصد کے لئے لازماً لے لیا جائے جن کا ذکر آگے نمبر (۴) میں آرہا ہے۔

(۳) مالیات میں اسلام افراد کے اس حق کو تسلیم کرتا ہے کہ ان کی آمدنیوں کا جو حصہ ان کی ضروریات سے بچ رہے، اسے جمع کریں، یا دوسروں کو قرض دیں، یا خود کسی کاروبار میں لگائیں یا کسی صنعت و تجارت میں اپنا سرمایہ دیکر اس کے نفع و نقصان میں حصہ دار بن جائیں۔ اگرچہ اسلام کی نگاہ میں پسندیدہ تو یہی ہے کہ لوگ اپنی فاضل آمدنیوں کو نیک کاموں میں خرچ کر دیا کریں، لیکن وہ مذکورۂ بالا چاروں طریقوں کو بھی جائز رکھتا ہے، بشرطیکہ وہ حسب ذیل قواعد کے پابند ہوں۔

جمع کرنے کی صورت میں وہ اس جمع شدہ دولت کا ۲½ فی صدی سالانہ حصہ لازماً اُن کاموں کے لئے دیتے رہیں جن کا ذکر آگے نمبر (۴) میں آرہا ہے، اور جب وہ مریں تو ان کا پورا سرمایہ اسلامی قانون میراث کے مطابق ان کے وارثوں میں تقسیم ہو جائے۔

قرض دینے کی صورت میں وہ صرف اپنا دیا ہوا سرمایہ ہی واپس لے سکتے ہیں۔ کسی حالت میں سود کے مستحق وہ نہیں ہیں، خواہ قرض لینے والے نے اپنے ذاتی مصارف میں صرف کرنے کے لئے قرض لیا ہو یا کسی صنعت و تجارت میں لگانے کے لئے۔ اسی طرح وہ اس امر کا حق بھی نہیں رکھتے کہ اگر اپنے دیئے ہوئے مال کی واپسی کا اطمینان کرنے کے لئے انہوں نے مدیون سے کوئی زمین یا جائداد رہن کے طور پر لی ہو تو وہ اس سے کسی قسم کا فائدہ اٹھائیں۔ فائدہ بہر حال سود ہے اور وہ کسی شکل میں بھی نہیں لیا جا سکتا۔ علیٰ ہذا القیاس یہ بھی جائز نہیں ہے کہ نقد خریداری کی صورت میں ایک مال کی قیمت کچھ ہو اور قرض پر خریدنے کی صورت میں اس سے زیادہ ہو۔

صنعت و تجارت یا زراعت میں براہ راست خود سرمایہ لگانے کی صورت میں ان کو اُن قواعد کا پابند ہونا پڑے گا جو نمبر (۱) اور (۲) میں ہم بیان کر چکے ہیں۔

حصہ داری کی صورت میں ان کو لازماً نفع اور نقصان میں یکساں شریک ہونا پڑے گا، اور وہ ایک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طے شدہ تناسب کے مطابق دونوں میں حصہ دار ہوں گے۔ شرکت کی کوئی ایسی صورت قانوناً جائز نہ ہوگی جس کی رو سے سرمایہ دینے والا صرف نفع میں شریک ہو، اور مقرر شرح منافع کا لازماً حق دار قرار پائے۔

(۴) اسلام معاشرے اور ریاست کے ذمہ یہ فرض عاید نہیں کرتا کہ وہ اپنے افراد کو روزگار فراہم کرے۔ اس لئے کہ فراہمی روزگار کی ذمہ داری بغیر اس کے نہیں لی جاسکتی کہ ذرائع پیداوار پر اجتماعی قبضہ یا کم از کم نازی طرز کا تسلط ہو، اور اس کی غلطی و مضرت پہلے بتائی جاچکی ہے۔ لیکن اسلام اس کو بھی صحیح نہیں سمجھتا کہ اجتماعی زندگی میں افراد کو بالکل ان کے اپنے ہی ذرائع اور اپنے ہی حالات پر چھوڑ دیا جائے اور آفت رسیدہ لوگوں کی خبر گیری کا کوئی بھی ذمہ دار نہ ہو۔ وہ ایک طرف ہر انسان پر فرداً فرداً یہ اخلاقی فریضہ عائد کرتا ہے کہ وہ اپنے اور پرائے، جس فرد بشر کو بھی مدد کا محتاج پائے اس کی مدد اپنی حد استطاعت تک ضرور کرے۔ دوسری طرف وہ صناعوں، تاجروں اور زمینداروں سے بھی یہ مطالبہ کرتا ہے کہ اپنے کاروبار کے سلسلہ میں جن لوگوں سے وہ کام لیتے ہیں ان کے حقوق کو ٹھیک ٹھیک ادا کریں۔ اور اس سب پر مزید یہ کہ وہ پورے معاشرے اور ریاست پر یہ ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ اس کے حدود عمل کے اندر رہنے والا کوئی شخص کم سے کم ضروریات زندگی سے محروم نہ رہنے پائے۔ معاشرے کے اندر جو لوگ بے روزگار ہو جائیں، یا کسی عارضی سبب سے ناقابل کار ہوں، یا کسی مستقل وجہ سے ناکارہ ہو جائیں، یا کسی حادثے اور آفت کے شکار ہوں، ان سب کو سہارا دینا ریاست کی ذمہ داری ہے۔ وہ بچے جن کا کوئی سرپرست نہیں، ان کی سرپرستی کرنا ریاست کا فریضہ ہے۔ وہ بیمار جو دوا اور علاج کا خرچ برداشت نہیں کرسکتے، ان کا علاج ریاست کے ذمہ ہے۔ جو پیٹ خالی ہے اسے بھرنا ریاست کا کام ہے اور جو تن ننگا ہے اسے کپڑا دینا ریاست کا فرض ہے۔ حد یہ ہے کہ جو شخص قرض دار ہو اور اپنا قرض ادا نہ کرسکے اس کا قرض بھی بالآخر ریاست پر جا پڑتا ہے۔ یہ سوشل انشورنس کی ایک وسیع ترین اسکیم ہے جو براہ راست ریاست کے انتظام میں روبعمل آنی چاہیئے۔ اس کے لئے مالی وسائل کی فراہمی کا انتظام اسلام حسب ذیل طریقہ پر تجویز کرتا ہے۔

ہر شخص جس نے ایک مقرر حد نصاب سے زائد سرمایہ جمع کر رکھا ہو، اپنے سرمایہ کا ۲½ فی صدی حصہ سالانہ زکوٰۃ میں دے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہر زمیندار و کاشتکار اپنی بارانی زمینوں کی پیداوار کا ۱۰ فیصدی اور چاہی و نہری زمینوں کی پیداوار کا ۵ فی صدی حصہ اِس مد میں ادا کرے۔

ہر صناع اور تاجر اپنی سالانہ آمدنی کا (منافع کا نہیں بلکہ آمدنی کا) ۲½ فی صدی حصہ دے۔

ہر گلہ بان جو ایک خاص مقدار نصاب سے زائد مویشی رکھتا ہو، ایک خاص تناسب کے مطابق اپنی حیوانی دولت کا ایک حصہ ہر سال حکومت کے حوالہ کر دے۔

معدنیات اور دفینوں میں سے بھی خُمس لیا جائے۔

اور کوئی جنگ پیش آئے تو اموال غنیمت میں سے بھی ۲۰ فیصدی حصہ اِن اغراض کے لئے الگ کر لیا جائے۔

یہ پوری دولت اُن مصارف کے لئے وقف ہوگی جو قرآن مجید میں زکوٰۃ اور خُمس کے لئے مقرر کئے گئے ہیں، جن کا ایک جزوِ اعظم سوشل انشورنس کی وہ اسکیم ہے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے[1]۔

(۵) اسلام اِس بات کو اصولاً پسند نہیں کرتا کہ حکومت خود صناع یا تاجر یا زمیندار بنے۔ اس کے نزدیک حکومت کا کام رہنمائی ہے، قیام عدل ہے، مفاسد کی روک تھام ہے، اور اجتماعی فلاح کی خدمت ہے۔ مگر سیاسی طاقت کے ساتھ سوداگری کو جمع کرنے کی قباحتیں اتنی زیادہ ہیں کہ وہ اِس کے چند ظاہری فوائد کی خاطر اُن کو گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ وہ صرف ایسی صنعتوں اور ایسے کاروبار کو حکومت کے انتظام میں چلانا جائز رکھتا ہے جو قومی زندگی کے لئے ضروری تو ہوں، مگر یا تو افراد انہیں چلانے کے لئے خود تیار نہ ہوں، یا انفرادی ہاتھوں میں ان کا رہنا اجتماعی مفاد کے لئے نقصان دہ ہو۔ اس قسم کے کاموں کے ماسوا دوسرے صنعتی و تجارتی کام اگر ملک کی ترقی و بہبود کی خاطر حکومت خود شروع کرے بھی تو اسکی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ایک خاص حد تک کامیابی کے ساتھ چلانے کے بعد وہ اس کاروبار کو انفرادی ہاتھوں میں منتقل کر دے۔

یہ حدود و ضوابط اور یہ اصلاحی تدبیریں اگر معیشت کے اُن سات فطری اصولوں کے ساتھ جمع کر دی جائیں جو جدید نظام سرمایہ داری" کے باب میں ہم بیان کر چکے ہیں، تو اس سے جاگیرداری و سرمایہ داری کی تمام خرابیوں کا سدِ باب ہو جاتا ہے اور ایک ایسا متوازن نظام معیشت بن جاتا ہے جس میں انفرادی آزادی

[1] زکوٰۃ اور خمس کے جن مسائل کا یہاں اشارۃً ذکر کیا گیا ہے ان کی تفصیلی ... ان سے متعلق ... مرتب کر دی جائیں گی۔
© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور اجتماعی فلاح، دونوں ٹھیک ٹھیک عدل کے ساتھ سموئے جا سکتے ہیں، بغیر اس کے کہ موجودہ صنعتی انقلاب کی رفتار ترقی میں ذرہ برابر بھی خلل آنے پائے[1]۔

[1] یہاں اُن مباحث کا اعادہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے جو اس کتاب کے ابتدائی حصہ میں بیان ہو چکے ہیں۔ اسلامی نظام معیشت پر جامع نظر حاصل کرنے کے لیے اس کتاب کا باب پنجم (اسلامی نظم معیشت اور اس کے ارکان) نگاہ میں رہنا ضروری ہے۔ نیز اس کے ساتھ میرا مقالہ "انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل" اور میری نشری تقریروں کا مجموعہ "اسلام کا نظام حیات" بھی پیش نظر رہے تو بہتر ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۶)

حرمتِ سود (سلبی پہلو)

متوازن معیشت کا جو نقشہ پچھلے باب میں پیش کیا گیا ہے اس کے بنیادی ستون چار ہیں:

(۱) آزاد معیشت چند قانونی اور انتظامی حدود و قیود کے اندر،

(۲) زکوٰۃ کی فرضیت،

(۳) سود کی حرمت،

(۴) قانونِ میراث۔

ان میں سے پہلے رکن کو کم از کم اصولی طور پر وہ سب لوگ اب درست تسلیم کرنے لگے ہیں جن کے سامنے بے قید سرمایہ داری کی قباحتیں اور اشتراکیت و فاشیت کی شناعتیں بے نقاب ہو چکی ہیں۔ البتہ اس کی تفصیلات کے بارے میں کچھ الجھنیں ذہنوں میں پائی جاتی ہیں جو بغیر اس کے دور نہیں ہو سکتیں کہ اسلام کے زرعی اور تجارتی قوانین مفصل طور پر مرتب کر دیئے جائیں۔ یہ چیز ہماری اس کتاب کے موضوع سے خارج ہے، مگر ہم کوشش کریں گے کہ جلدی سے جلدی یہ خدمت بھی انجام پا جائے۔

زکوٰۃ کی اہمیت اب بڑی حد تک دنیا کے سامنے واضح ہو چکی ہے، اور کسی صاحب نظر سے یہ بات مخفی نہیں رہی ہے کہ اشتراکیت، فاشزم اور سرمایہ دارانہ جمہوریت، تینوں نے اب تک سوشل انشورنس کا جو وسیع سے وسیع نظام سوچا ہے، زکوٰۃ اس سے بہت زیادہ وسیع پیمانے پر اجتماعی انشورنس کا انتظام کرتی ہے لیکن یہاں بھی کچھ الجھنیں زکوٰۃ کے تفصیلی احکام معلوم نہ ہونے کی وجہ سے پیش آتی ہیں۔ اور لوگوں کے لئے یہ بات سمجھنی بھی مشکل ہو رہی ہے کہ ایک جدید ریاست کے مالیات میں زکوٰۃ و خمس کو کس طرح نصب کیا جا سکتا ہے۔ اس چیز پر بھی انشاء اللہ ایک الگ رسالے میں بحث کی جائے گی۔

قانونِ میراث کے بارے میں اسلام نے تمام دنیا کے قوانینِ وراثت سے ہٹ کر جو مسلک اختیار کیا ہے، پہلے اس کی حکمتوں سے بکثرت لوگ ناواقف تھے اور طرح طرح کے اعتراضات اس پر کرتے تھے۔ لیکن اب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تبدریج ساری دنیا اسکی طرف رجوع کرتی جارہی ہے۔ حتیٰ کہ روسی اشتراکیت کو بھی اسکی خوشہ چینی کرنی پڑی ہے[1] سب سے بڑھ کر اس نقشے کے جس رکن کو سمجھنے میں موجودہ زمانے کے لوگوں کو زحمت پیش آرہی ہے وہ تحریم سود ہے۔ اوّل تو بورژوا علم معیشت نے پچھلی صدیوں میں یہ تخیل بڑی گہری جڑوں کے ساتھ جمادیا ہے کہ سود کی حرمت محض ایک جذباتی چیز ہے، اور یہ کہ بلا سود کسی شخص کو قرض دینا محض ایک اخلاقی رعایت ہے جس کا مطالبہ مذہب نے خواہ مخواہ اس قدر مبالغہ کے ساتھ کردیا ہے ورنہ بلحاظ منطقی حیثیت سے سود سراسر ایک معقول چیز ہے، اور معاشی حیثیت سے وہ صرف ناقابل اعتراض ہی نہیں بلکہ عملاً مفید اور ضروری بھی ہے پھر ایک بڑی غلط فہمی شکست خوردہ اہل مذہب میں یہ پھیل گئی ہے کہ سود کوئی قابل اعتراض چیز اگر ہے بھی تو صرف اُس صورت میں جب کہ وہ اُن لوگوں سے وصول کیا جائے جو اپنی ذاتی ضروریات پر خرچ کرنے کے لئے قرض لیتے ہیں، رہے وہ قرضے جو کاروبار میں لگانے کے لئے حاصل کیئے گئے ہوں، تو ان پر سود کا لین دین سراسر جائز، معقول اور حلال وطیب ہے، اور اس میں دین، اخلاق، عقل اور اصولِ علم معیشت کسی چیز کے اعتبار سے بھی کوئی قباحت نہیں ہے۔ اس پر مزید وہ خوش فہمیاں ہیں جن کی بنا پر قدیم طرز کے بنیوں اور مہاجنوں کی سودخواری سے موجودہ زمانہ کے بنکنگ کو ایک مختلف چیز سمجھا جاتا ہے اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان بنکوں کا ستھرا کاروبار تو بالکل ایک پاکیزہ چیز ہے جس سے ہر قسم کا تعلق رکھا جا سکتا ہے۔ ان تمام مغالطوں کے چکر سے جو لوگ نکل گئے ہیں وہ بھی یہ سمجھنے میں مشکل محسوس کر رہے ہیں کہ سود کو قانوناً بند کر دینے کے بعد موجودہ زمانہ میں مالیات کا نظم کس طرح قائم ہو سکتا ہے۔

آئندہ صفحات میں ہم انہی مسائل کو صاف کرنے کی کوشش کریں گے۔

---

[1] سوویٹ روس کے تازہ ترین قانونِ وراثت میں اولاد، بیوی، شوہر، والدین، بھائیوں، بہنوں، اور متبنیٰ کو وارث ٹھہرایا گیا ہے۔ نیز یہ قاعدہ بھی مقرر کیا گیا ہے کہ آدمی اپنا ترکہ اپنے حاجت مند قریبی رشتہ داروں اور پبلک اداروں میں تقسیم کرنے کی وصیت کر سکتا ہے مگر رشتہ داروں کا حق مقدم ہے۔ اس کے ساتھ ایسی وصیت ممنوع ٹھیرائی گئی ہے جس کا مقصود نابالغ اولاد یا غریب وارثوں کو حق وراثت سے محروم کرنا ہو۔ اس قانون کو دیکھ کر کوئی شخص یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اشتراکی "ترقی پسندوں" نے ۱۹۴۵ میں اُس قانون کی طرف رجعت فرمائی ہے جو ۱۹۲۵-۲۶ میں بنایا گیا تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سود کی عقلی توجیہات سب سے پہلے جس بات کو طے ہونا چاہیئے وہ یہ ہے کہ کیا فی الواقع سود ایک معقول چیز ہے؟ کیا درحقیقت عقل کی رو سے ایک شخص اپنے دیئے ہوئے قرض پر سود کا مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہے؟ اور کیا انصاف یہی چاہتا ہے کہ جو شخص کسی سے قرض لے وہ اسکو اصل کے علاوہ کچھ نہ کچھ سود بھی دے؟ یہ اس بحث کا اوّلین سوال ہے اور اس کے طے ہو لینے سے آدھی سے زیادہ بحث آپ سے آپ طے ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اگر سود ایک معقول چیز ہے تو پھر تحریم سود کے معاملے میں کوئی جان باقی نہیں رہتی۔ اور اگر سود کو عقل و انصاف کی رو سے درست ثابت نہیں کیا جا سکتا تو پھر یہ امر غور طلب ہو جاتا ہے کہ انسانی معاشرے میں اس نامعقول چیز کو باقی رکھنے پر آخر کیوں اصرار کیا جائے۔

توجیہ اوّل اس سوال کے جواب میں سب سے پہلے جس دلیل سے ہم کو سابقہ پیش آتا ہے وہ یہ ہے کہ جو شخص کسی دوسرے شخص کو اپنا پس انداز کیا ہوا مال قرض دیتا ہے وہ خطرہ مول لیتا ہے، ایثار کرتا ہے، اپنی ضرورت روک کر دوسرے کی ضرورت پوری کرتا ہے، جس مال سے وہ خود فائدہ اٹھا سکتا تھا اسے دوسرے کے حوالہ کرتا ہے۔ قرض لینے والے نے اگر قرض اس لئے لیا ہے کہ اپنی کوئی ذاتی ضرورت اس سے پوری کرے تو اسے اس مال کا کرایہ ادا کرنا چاہیئے جس طرح وہ مکان یا فرنیچر یا سواری کا کرایہ ادا کرتا ہے۔ یہ کرایہ اس خطرے کا معاوضہ بھی ہوگا جو دائن نے اپنا مال اس کے حوالہ کرنے میں برداشت کیا، اور اس امر کا معاوضہ بھی ہوگا کہ دائن نے اپنی محنت سے کمائی ہوئی دولت خود استعمال کرنے کے بجائے اس کو استعمال کرنے کے لئے دے دی۔ اور اگر مدیون نے یہ قرض کسی نفع آور کام میں لگانے کے لئے لیا ہے تو پھر تو دائن اس پر سود مانگنے کا بدرجۂ اولیٰ مستحق ہے۔ جب مدیون اسکی دی ہوئی دولت سے فائدہ اٹھا رہا ہے تو آخر دائن اس فائدے میں سے کیوں نہ حصہ پائے۔

اس توجیہ کا یہ حصہ بالکل درست ہے کہ قرض دینے والا اپنا مال دوسرے کے حوالہ کرنے میں خطرہ بھی مول لیتا ہے اور ایثار بھی کرتا ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ کیسے نکل آیا کہ وہ اس خطرے اور اس ایثار کی ایک قیمت ۵، ۱۰، یا ۱۵ فی صدی سالانہ یا ششماہی یا ماہوار کے حساب سے وصول کرنے کا حق رکھتا ہے۔ خطرے کی بنیاد پر جو حقوق معقول طریقہ سے اسکو پہنچتے ہیں وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہیں کہ وہ مدیون کی کوئی چیز رہن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رکھ سکے یا اسکی کسی چیز کی کفالت پر قرض دے یا اس سے کوئی ضمانت طلب کرے، یا پھر سرے سے خطرہ ہی قبول نہ کرے اور قرض دینے سے انکار کر دے۔ مگر خطرہ تو کوئی مالِ تجارت ہے جس کی کوئی قیمت ہو، اور نہ وہ کوئی مکان یا فرنیچر یا سواری ہے کہ اس کا کوئی کرایہ ہو سکے۔ رہا ایثار تو وہ اُسی وقت تک ایثار ہے جب تک کہ وہ کاروبار نہ ہو۔ آدمی کو ایثار کرنا ہو تو پھر ایثار ہی کرے اور اس اخلاقی فعل کے اخلاقی فوائد پر راضی رہے۔ اور اگر وہ معاوضے کی بات کرتا ہے تو پھر ایثار کا ذکر نہ کرے بلکہ سیدھی طرح سوداگری کرے اور یہ بتائے کہ وہ قرض کے معاملہ میں اصل رقم کے علاوہ ایک مزید رقم ماہوار یا سالانہ کے حساب سے جو وصول کرتا ہے اس کا آخر وہ کس بنیاد پر مستحق ہے؟

کیا وہ ہرجانہ ہے؟ مگر جو رقم اس نے قرض دی ہے وہ اسکی ضرورت سے زائد تھی۔ اور اسے وہ خود استعمال بھی نہیں کر رہا تھا۔ اس لئے یہاں فی الواقع کوئی "ہرج" واقع ہی نہیں ہوا کہ اپنے دیئے ہوئے اس قرض پر وہ کوئی "ہرجانہ" لینے کا مستحق ہو۔

کیا یہ کرایہ ہے؟ مگر کرایہ تو ان چیزوں کا ہوا کرتا ہے جنہیں کرایہ دار کے لئے مہیا کرنے اور درست رکھنے پر آدمی اپنا وقت، محنت اور مال صرف کرتا ہے اور جو کرایہ دار کے استعمال سے خراب ہوتی ہیں، ٹوٹتی پھوٹتی ہیں اور اپنی قیمت کھوتی رہتی ہیں۔ یہ تعریف اشیاء استعمال مثلاً مکان، فرنیچر اور سواری وغیرہ پر تو صادق آتی ہے، اور انہی کا کرایہ ایک معقول چیز ہے۔ لیکن اس تعریف کا اطلاق کسی طرح بھی اشیاء صرف (مثلاً گیہوں اور پھل) یا روپے پر نہیں ہو سکتا، اس لئے ان کا کرایہ بالکل ایک بے معنی چیز ہے۔

زیادہ سے زیادہ وہ جو کچھ کہہ سکتا ہے وہ یہ ہے کہ میں دوسرے شخص کو اپنے مال سے فائدہ اٹھانے کا موقع دے رہا ہوں لہٰذا مجھے اس فائدے میں سے حصہ ملنا چاہیئے۔ یہ البتہ ایک معقول بات ہے مگر سوال یہ ہے کہ جس فاقہ کش آدمی نے اپنے بھوکے بال بچوں کا پیٹ بھرنے کے لئے تم سے ۵ سیر گیہوں قرض لیئے ہیں، یا جس نے اپنے بیمار بچے یا بیوی یا ماں کا علاج کرنے کے لئے تم سے ۵۰ روپے عاریتہً حاصل کیئے ہیں، کیا واقعی وہ تمہارے دیئے ہوئے غلے یا روپے سے ایسا ہی "فائدہ" اٹھا رہا ہے جس میں سے تم ایک چھٹانک فی سیر یا ۲ روپے فی صد ماہوار کے حساب سے اپنا حصہ پانے کے مستحق ہو؟ فائدہ تو وہ بے شک اٹھا رہا ہے، اور اس استفادے کا موقع

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بلاشبہ تم نے ہی اسے دیا ہے، لیکن عقل، انصاف، معاشی علم، کاروباری اصول، آخر کس چیز کی رو سے اس فائدے اور اس موقعِ استفادہ کی یہ نوعیت قرار پاتی ہے کہ تم اسکی ایک مالی قیمت مشخص کرو، اور قرض مانگنے والے کی مصیبت جتنی زیادہ سخت ہو اتنی ہی یہ قیمت بھی زیادہ ہو جائے، اور اسکی مصیبت زدگی کا زمانہ جتنا دراز ہوتا جائے تمہارے دیئے ہوئے اس "موقع استفادہ" کی قیمت بھی مہینوں اور برسوں کے حساب سے اُس پر بڑھتی اور چڑھتی چلی جائے؟ تم اگر اتنا بڑا دل نہیں رکھتے کہ ایک حاجت مند اور آفت رسیدہ انسان کو اپنی ضرورت سے زائد بچا ہوا مال عطا کر دو، تو حد سے حد جو بات تمہارے لئے معقول ہو سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اپنی رقم کی واپسی کا اطمینان کر کے اسے قرض دے دو۔ اور اگر تمہارے دل میں قرض دینے کی بھی گنجائش نہیں ہے تو بدرجۂ آخر یہ بھی ایک معقول بات ہو سکتی ہے کہ تم سرے سے اسکو کچھ نہ دو۔ مگر کاروبار اور تجارت کی یہ کونسی معقول صورت ہے کہ ایک شخص کی مصیبت اور تکلیف تمہارے لئے نفع اندوزی کا موقع ٹھہرے، بھوکے پیٹ اور جاں بلب مریض تمہارے لئے روپیہ لگانے کی جگہ (Investment) قرار پائیں، اور انسانی مصائب جتنے بڑھیں اتنے ہی تمہارے نفع کے امکانات بھی بڑھتے چلے جائیں!

"فائدہ اٹھانے کا موقع دینا" اگر کسی صورت میں کوئی مالی قیمت رکھتا ہے تو وہ صرف وہ صورت ہے جب کہ روپیہ لینے والا اسے کسی کاروبار میں لگا رہا ہو۔ اس صورت میں البتہ روپیہ دینے والا یہ کہنے کا حق رکھتا ہے کہ مجھے اُس فائدے میں سے حصہ ملنا چاہیئے جو میرے روپے سے دوسرا شخص اٹھا رہا ہے۔ لیکن جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کا پس انداز کیا ہوا روپیہ کسی نفع آور کاروبار میں لگے اور کچھ فائدہ لائے اس کے لئے سیدھا اور معقول طریقہ یہ ہے کہ وہ قرض دینے کے بجائے کسی کاروباری آدمی کے ساتھ شرکت کا معاملہ کرے اور نفع و نقصان میں ایک طے شدہ تناسب کے مطابق حصہ دار بن جائے۔ نفع کمانے کا یہ آخر کونسا معقول طریقہ ہے کہ میں ایک شخص کا شریک بننے کے بجائے اُسے سو روپے قرض دوں اور اس سے کہوں کہ چونکہ تو اس رقم سے فائدہ اٹھائے گا اس لئے تجھ پر میرا یہ حق ہے کہ مجھے مثلاً ایک روپیہ ماہوار اس وقت تک دیتا رہ جب تک میرے یہ روپے تیرے کاروبار میں استعمال ہو رہے ہیں؟ سوال یہ ہے کہ اگر وہ شخص کاروبار میں فائدے کے بجائے نقصان اٹھائے تو میں کس عقل و انصاف کی رو سے یہ ماہوار منافع اس سے وصول کرنے کا حق رکھتا ہوں؟ اور اگر اس کا منافع ایک روپیہ ماہوار سے کم رہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تو مجھے ایک روپیہ ماہوار لینے کا کیا حق ہے؟ اور اگر اس کا کل منافع ایک ہی روپیہ ہو تو کونسا انصاف یہ جائز رکھتا ہے کہ جس شخص نے مہینہ بھر تک اپنا وقت، محنت، قابلیت اور ذاتی سرمایہ، سب کچھ صرف کیا وہ تو کچھ نہ پائے اور میں جو صرف سو روپے اسکو دے کر الگ ہو گیا تھا، اس کا سارا منافع لے اڑوں؟ ایک بیل بھی اگر تیلی کے لئے دن بھر کولہو چلاتا ہے تو کم از کم اس سے چارہ مانگنے کا حق تو ضرور رکھتا ہے۔ مگر یہ سودی قرض ایک کاروباری آدمی کو وہ بیل بنا دیتا ہے جسے کولہو تو دن بھر میرے لیئے چلانا چاہیئے اور چارہ کہیں اور سے کھانا چاہیئے!

پھر اگر بالفرض ایک کاروباری آدمی کا منافع اُس متعین رقم سے زائد بھی رہے جو قرض دینے والے نے سود کے طور پر اس کے ذمہ لگائی ہو، تب بھی عقل، انصاف، اصولِ تجارت، اور قانونِ معیشت، کسی چیز کی رو سے بھی اس بات کو معقول ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ تاجر، صناع، کاشتکار، اور دوسرے تمام وہ لوگ جو اصل عاملینِ پیدائش ہیں، جو سوسائٹی کی ضروریات تیار اور فراہم کرنے میں اپنے اوقات صرف کرتے ہیں، محنتیں برداشت کرتے ہیں، دماغ لڑاتے ہیں، اور اپنے جسم و ذہن کی ساری قوتیں کھپا دیتے ہیں، اُن سب کا فائدہ تو مشتبہ اور غیر معیّن ہو مگر صرف اُس ایک آدمی کا فائدہ یقینی اور معیّن ہو جس نے اپنی پس انداز کی ہوئی رقم قرض دے دی ہے؟ اُن سب کے لئے تو نقصان کا خطرہ بھی ہو مگر اس کے لئے خالص نفع کی گارنٹی ہو؟ اُن سب کے نفع کی شرح بازار کی قیمتوں کے ساتھ گرتی اور چڑھتی رہے، مگر یہ ایک اللہ کا بندہ جو نفع اپنے لئے طے کر چکا ہے وہ اسے جوں کا توں ماہ بماہ اور سال بسال ملتا رہے؟[1]

توجیہ دوم | اس تنقید سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بادی النظر میں سود کو ایک معقول چیز قرار دینے کے لئے جو دلائل کافی سمجھ لیئے جاتے ہیں، ذرا گہرائی میں جاتے ہی ان کی کمزوری کھلنی شروع ہو جاتی ہے۔ جہاں تک اُس قرض کا تعلق ہے جو شخصی حاجات کے لئے لیا جاتا ہے، اس پر سود عائد ہونے کے لئے تو سرے سے کوئی عقلی دلیل

---

[1] اس مقام پر ایک شخص یہ اعتراض کر سکتا ہے کہ پھر تم زمین کے لگان کو کس طرح جائز ٹھہراتے ہو جبکہ اسکی پوزیشن بھی بعینہ سود کی سی ہے؟ مگر درحقیقت یہ اعتراض صرف اُن لوگوں پر وارد ہوتا ہے جو زمین کے نقد لگان، مثلاً ۲۰ روپیہ بیگھہ یا ۵ روپیہ ایکڑ کے حساب سے پیشگی معین کر لینے کو جائز قرار دیتے ہیں۔ میں اس چیز کا قائل نہیں ہوں، بلکہ میں خود بھی اسے سود سے مشابہ سمجھتا ہوں، اس لیئے اس اعتراض کا جواب میرے ذمہ نہیں ہے۔ میرا مسلک یہ ہے کہ مالک زمین اور کاشتکار کے درمیان معاملہ کی صحیح صورت صرف بٹائی ہے، یعنی یہ کہ جتنی پیداوار ہوگی اس کا اتنا حصہ زمیندار کا اور اتنا کاشتکار کا۔ یہ معاملہ تجارتی حصہ داری سے مشابہ ہے اور اسکو میں جائز سمجھتا ہوں۔

© rasailojaraid.com

موجود ہی نہیں ہے۔ حتی کہ حامیان سود نے خود ہی اس کمزور مقدمے سے ہاتھ اٹھا لیا ہے۔ رہا وہ قرض جو کاروباری اغراض کے لئے لیا جاتا ہے، تو اس کے بارے میں بھی حامیان سود کو اس پیچیدہ سوال سے سابقہ پیش آتا ہے کہ سود آخر کس چیز کی قیمت ہے؟ ایک دائن اپنے سرمایہ کے ساتھ مدیون کو وہ کونسی جوہری (Substantial) چیز دیتا ہے جس کی ایک مالی قیمت، اور وہ بھی ماہ بماہ و سال بسال ادا شدنی قیمت مانگنے کا اسے حق پہنچتا ہو؟

اس چیز کے مشخص کرنے میں حامیان سود کو خاصی پریشانی پیش آئی ہے۔ ایک گروہ نے کہا کہ وہ فائدہ اٹھانے کا موقع ہے۔ لیکن جیسا کہ اوپر کی تنقید سے آپ کو معلوم ہو چکا ہے "یہ موقع" کسی متعین اور یقینی اور معلوم مقدار قیمت کا استحقاق پیدا نہیں کرتا، بلکہ صرف اس صورت میں ایک متناسب نفع کا استحقاق پیدا کرتا ہے جب کہ فی الواقع روپیہ لینے والے کو نفع ہو۔ دوسرا گروہ تھوڑی سی پوزیشن تبدیل کر کے کہتا ہے کہ وہ چیز "مہلت" ہے جو دائن اپنے سرمایہ کے ساتھ اس کے استعمال کے لئے مدیون کو دیتا ہے۔ یہ مہلت بجائے خود اپنی ایک قیمت رکھتی ہے اور جس قدر دراز ہوتی جائے اسکی قیمت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ جس روز آدمی روپیہ لے کر کام میں لگاتا ہے، اس روز سے لے کر اس دن تک جب کہ اس سرمایہ کے ذریعے سے تیار کیا ہوا مال بازار میں پہنچے اور قیمت لائے، ایک ایک لمحہ کاروباری آدمی کے لئے قیمتی ہے۔ یہ مہلت اگر اسے نہ ملے اور بیچ ہی میں سرمایہ اس سے واپس لے لیا جائے تو سرے سے اس کا کاروبار چل ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا یہ وقت روپیہ لے کر لگانے والے کے لئے یقیناً ایک قیمت رکھتا ہے جس سے وہ فائدہ اٹھا رہا ہے پھر کیوں نہ روپیہ دینے والا اس فائدہ میں سے حصہ لے؟ اور اس وقت کی کمی و بیشی کے ساتھ مدیون کے لئے نفع کے امکانات بھی لامحالہ کم و بیش ہوتے ہیں، پھر کیوں نہ دائن وقت ہی کی درازی و کوتاہی کے لحاظ ہی سے اسکی قیمت مشخص کرے؟

مگر یہاں پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر روپیہ دینے والے کو کس ذریعۂ علم سے یہ معلوم ہو گیا کہ جو شخص کام میں لگانے کے لئے اس سے روپیہ لے رہا ہے وہ ضرور نفع ہی حاصل کرے گا، نقصان سے دوچار نہ ہوگا؟ اور پھر یہ اس نے کیسے جانا کہ اس کو نفع بھی لازماً اس قدر تو ضرور رہے گا لہٰذا ضرور اتنے فی صدی کے حساب سے اس کو روپیہ دینے والے کا حصہ ادا کرنا چاہئیے اور پھر اس کے پاس یہ حساب لگانے کا آخر کیا ذریعہ ہے کہ وہ وقت جس کے دوران میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ مدیون کو اپنے روپے کے استعمال کی مہلت دے رہا ہے لازماً ہر مہینے اور ہر سال اتنا نفع لاتا رہے گا لہٰذا ضرور اُس کی ماہوار و سالانہ قیمت یہ قرار پانی چاہیئے؟ ان سوالات کا کوئی معقول جواب حامیانِ سود کے پاس نہیں ہے۔ اس لئے بات پھر وہیں آجاتی ہے کہ کاروباری معاملات میں اگر کوئی چیز معقول ہے تو وہ صرف نفع و نقصان کی شرکت اور متناسب حصہ داری ہے نہ کہ سود جو ایک متعین شرح کے ساتھ عائد کر دیا جائے۔

توجیہ سوم | ایک اور گروہ کہتا ہے کہ نفع آوری سرمایہ کی ذاتی صفت ہے، لہٰذا ایک شخص کا دوسرے کے فراہم کردہ سرمایہ کو استعمال کرنا بجائے خود اس امر کا استحقاق پیدا کرتا ہے کہ وہ اُن سود مانگے اور مدیون اسے ادا کرے۔ سرمایہ یہ قوت رکھتا ہے کہ اشیاء ضرورت کی تیاری و فراہمی میں مددگار ہو۔ سرمایہ کی مدد سے اتنا سامان تیار ہوتا ہے جتنا اُسکی مدد کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ سرمایہ کی مدد شامل حال ہونے سے زیادہ مقدار میں زیادہ اچھا مال تیار ہوتا ہے اور اچھی قیمت دینے والی منڈیوں تک پہنچ سکتا ہے، ورنہ کم اور گھٹیا مال تیار ہوتا ہے اور ایسے مواقع پر نہیں پہنچ سکتا جہاں زیادہ قیمت مل سکے۔ یہ ثبوت ہے اس امر کا کہ نفع آوری ایک ایسی صفت ہے جو سرمایہ کی ذات میں ودیعت کر دی گئی ہے، لہٰذا مجرد اس کا استعمال ہی سود کا استحقاق پیدا کر دیتا ہے۔

لیکن اول تو یہ دعویٰ ہی بداہتہً غلط ہے کہ سرمایہ میں "نفع آوری" نام کی کوئی ذاتی صفت پائی جاتی ہے۔ یہ صفت تو اس میں صرف اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ آدمی اسے لے کر کسی مثمر کام میں لگائے۔ صرف اسی صورت میں تم یہ کہہ سکتے ہو کہ روپیہ لینے والا چونکہ اس سے ایک نافع کام لے رہا ہے اس لئے اسے نفع میں سے حصہ دینا چاہیئے۔ مگر جو شخص بیماری میں علاج پر صرف کرنے کے لئے، یا کسی میت کی تجہیز و تکفین کے لئے روپیہ قرض لے رہا ہے اُس کے پاس یہ سرمایہ آخر کونسی معاشی قدر پیدا کرتا ہے جس میں حصہ بٹانے کا حق دائن کو پہنچتا ہو؟

پھر جو سرمایہ نفع آور کاموں میں لگایا جاتا ہے وہ بھی لازماً زیادہ قیمت ہی پیدا نہیں کرتا کہ یہ دعوے کیا جا سکے کہ نفع بخشی اسکی ذاتی صفت ہے۔ بسا اوقات کسی کام میں زیادہ سرمایہ لگا دینے سے نفع بڑھنے کے بجائے گھٹ جاتا ہے، یہاں تک کہ اُلٹے نقصان کی نوبت آجاتی ہے۔ آج کل تجارتی دنیا پر تھوڑی تھوڑی مدت بعد جو بحرانی دورے پڑتے رہتے ہیں اُن کی وجہ یہی تو ہے کہ جب سرمایہ دار کاروبار میں بے تحاشا سرمایہ لگاتے چلے جاتے ہیں اور پیداوار بڑھنی شروع ہوتی ہے تو قیمتیں گرنے لگتی ہیں اور افزونیِ مال کے ساتھ ارزانیِ قدر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رفتہ رفتہ اس حد کو پہنچ جاتی ہے کہ سرمایہ لگانے سے کسی نفع کی توقع باقی نہیں رہتی۔

مزید برآں سرمایہ میں نفع آوری کی اگر کوئی صفت ہے بھی تو اُس کا قوت سے فعل میں آنا بہت سی دوسری چیزوں پر منحصر ہے۔ مثلاً اس کے استعمال کرنے والوں کی محنت، قابلیت، ذہانت اور تجربہ کاری۔ دورانِ استعمال میں معاشی، تمدنی اور سیاسی حالات کی سازگاری۔ آفاتِ زمانہ سے محفوظیت۔ یہ اور ایسے ہی دوسرے امور نفع بخشی کے لازمی شرائط ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک شرط بھی نہ پائی جائے تو بسا اوقات سرمایہ کی ساری نفع بخشی ختم ہو جاتی ہے، بلکہ الٹی نقصان میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ مگر سودی کاروبار میں سرمایہ دینے والا نہ تو خود ان شرطوں کو پورا کرنے کی ذمہ داری لیتا ہے، اور نہ یہی مانتا ہے کہ اگر ان میں سے کسی شرط کے مفقود ہو جانے سے اس کا سرمایہ نفع آور نہ ہو سکا تو وہ کوئی سود لینے کا حق دار نہ ہوگا۔ وہ تو اس بات کا مدعی ہے کہ اس کے سرمایہ کا استعمال بجائے خود سود کا استحقاق پیدا کرتا ہے خواہ فی الواقع کوئی "نفع آوری" اس سے ظہور میں آئی ہو یا نہ آئی ہو۔

بدرجۂ آخر اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ سرمایہ کی ذات ہی میں نفع بخشی موجود ہے جس کی بنا پر سرمایہ دینے والا نفع میں سے حصہ پانے کا مستحق ہے، تب بھی آخر وہ کونسا حساب ہے جس سے تعین کے ساتھ یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ آج کل سرمایہ کی نفع بخشی لازماً اس قدر ہے لہٰذا جو لوگ سرمایہ لے کر استعمال کریں اُن کو لازماً اس شرح سے سود ادا کرنا چاہیئے؟ اور اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ زمانۂ حال کے لئے اس شرح کا تعین کسی حساب سے ممکن ہے تو ہم یہ سمجھنے سے تو بالکل ہی قاصر ہیں کہ جو سرمایہ دار ۱۹۴۹ء میں کسی کاروباری ادارے کو ۱۰ سال کے لئے، اور کسی دوسرے ادارے کو ۲۰ سال کے لئے رائج الوقت شرحِ سود پر قرض دے رہا ہے اس کے پاس یہ معلوم کرنے کا آخر کیا ذریعہ ہے کہ آئندہ دس اور بیس سال کے دوران میں سرمایہ کی نفع بخشی ضرور آج ہی کے معیار پر قائم رہے گی؟ خصوصاً جب کہ ۱۹۵۹ء میں بازار کی شرح سود ۱۹۴۹ء سے بالکل مختلف ہو اور ۱۹۶۹ء میں اس سے بھی زیادہ مختلف ہو جائے تب کس دلیل سے اُس شخص کو حق بجانب ٹھہرایا جائیگا جس نے ایک ادارے سے دس سال کے لئے اور دوسرے ادارے سے بیس سال کے لئے ۱۹۴۹ء کی شرح کے مطابق سرمایہ کے متوقع منافع میں سے اپنا حصہ قطعی طور پر متعین کر لیا تھا؟

توجیہ چہارم | آخری توجیہ میں ذرا زیادہ ذہانت صرف کی گئی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انسان فطرةً حاضر فائدے کے، لطف، لذت اور آسودگی کو دور دراز مستقبل کے فوائد ولذائذ پر ترجیح دیتا ہے:
مستقبل جتنا دور ہو اسی قدر اس کے فوائد ولذائذ مشتبہ ہوتے ہیں اور اسی مناسبت سے آدمی کی نگاہ میں
ان کی قیمت کم ہوتی جاتی ہے۔ اس ترجیحِ عاجلہ اور مرجوحیتِ آجلہ کے متعدد وجوہ ہیں، مثلاً:-

۱- مستقبل کا تاریکی میں ہونا اور زندگی کا غیر یقینی ہونا جس کی وجہ سے مستقبل کے فوائد مشتبہ بھی ہوتے ہیں اور اُن کی کوئی واضح تصویر بھی آدمی کی چشم تصور میں نہیں ہوتی۔ بخلاف اس کے آج جو نقد فائدہ حاصل ہو رہا ہے وہ یقینی بھی ہے اور اسکو آدمی بچشم سر بھی دیکھ رہا ہے۔

۲- جو شخص اس وقت حاجت مند ہے اُسکی حاجت کا اِس وقت پورا ہو جانا اُس کے لئے اس سے بہت زیادہ قیمت رکھتا ہے کہ آئندہ کسی موقع پر اُسکو وہ چیز ملے جس کا ممکن ہے کہ وہ اُس وقت حاجت مند ہو اور ممکن ہے کہ نہ ہو۔

۳- جو مال اس وقت مل رہا ہے وہ بالفعل کارآمد اور قابل استعمال ہے، اس لحاظ سے وہ اُس مال پر فوقیت رکھتا ہے جو آئندہ کسی وقت حاصل ہوگا۔

ان وجوہ سے حاضر کا نقد فائدہ مستقبل کے مشتبہ فائدے پر ترجیح رکھتا ہے۔ لہٰذا آج جو شخص ایک رقم قرض لے رہا ہے اسکی قیمت لازماً اُس رقم سے زیادہ ہے جو وہ کل دائن کو ادا کرے گا، اور سود وہ قدر زائد ہے جو ادائیگی کے وقت اصل کے ساتھ شامل ہو کر اسکی قیمت کو اُس رقم کے برابر کرتی ہے جو قرض دیتے وقت دائن نے اسکو دی تھی۔ مثال کے طور پر اس معاملہ کو یوں سمجھیے کہ ایک شخص ساہوکار کے پاس آتا ہے اور اس سے سو روپے قرض مانگتا ہے۔ ساہوکار اس سے یہ بات طے کرتا ہے کہ آج جو سو روپے وہ اسکو دے رہا ہے ان کے بدلے میں وہ ایک سال بعد اس سے ۱۰۳ روپے لیگا۔ اس معاملہ میں دراصل حاضر کے ۱۰۰ روپوں کا تبادلہ مستقبل کے ۱۰۳ روپوں سے ہو رہا ہے۔ تین روپے اُس فرق کے برابر ہیں جو حاضر کے مال اور مستقبل کے مال کی نفسیاتی (نہ کہ معاشی) قیمت کے درمیان پایا جاتا ہے۔ جب تک یہ تین روپے ایک سال بعد کے سو روپوں کے ساتھ شامل نہ ہوں گے ان کی قیمت اُن سو روپوں کے برابر نہ ہوگی جو قرض دیتے وقت دائن نے مدیون کو دیئے تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ توجیہ جس ہوشیاری کے ساتھ کی گئی ہے اسکی داد نہ دینا ظلم ہے۔ مگر درحقیقت اس میں حاضر اور مستقبل کی نفسیاتی قیمت کا جو فرق بیان کیا گیا ہے وہ ایک مغالطہ کے سوا کچھ نہیں ہے۔

کیا فی الواقع انسانی فطرت حاضر کو مستقبل کے مقابلہ میں زیادہ اہم اور زیادہ قیمتی سمجھتی ہے؟ اگر یہ بات ہے تو کیا وجہ ہے کہ بیشتر لوگ اپنی ساری کمائی کو آج ہی خرچ کر ڈالنا مناسب نہیں سمجھتے بلکہ اس کے ایک حصے کو مستقبل کے لئے بچا رکھنا زیادہ پسند کرتے ہیں؟ شاید آپ کو ایک فی صدی بھی ایسے آدمی نہ ملیں گے جو فکر فردا سے بے نیاز ہوں اور آج کے لطف و لذت پر اپنا سارا مال اُڑا دینے کو ترجیح دیتے ہوں۔ کم از کم ۹۹ فی صدی انسانوں کا حال تو یہی ہے کہ وہ آج کی ضرورتوں کو روک کر کل کے لئے کچھ نہ کچھ سامان کر رکھنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ مستقبل میں پیش آنے والی بہت سی متوقع اور ممکن ضرورتیں اور اندیشناک صورتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا خیالی نقشہ آدمی کی نگاہ میں اُن حالات کی بہ نسبت زیادہ بڑا اور اہم ہوتا ہے جن سے وہ اس وقت کسی نہ کسی طرح تشتم پشتم گزرے جا رہا ہے پھر وہ ساری دوڑ دھوپ اور تگ و دو جو ایک انسان زمانۂ حال میں کرتا ہے اُس سے مقصود آخر اس کے سوا کیا ہوتا ہے کہ اس کا مستقبل بہتر ہو؟ اپنی آج کی محنتوں کے سارے ثمرات آدمی اسی کوشش میں تو کھپاتا ہے کہ اس کے آنے والے ایام زندگی آج سے زیادہ اچھی طرح بسر ہوں۔ کوئی احمق سے احمق آدمی بھی بمشکل آپ کو ایسا مل سکیگا جو اس قیمت پر اپنے حاضر کو خوش آئند بنانا پسند کرتا ہو کہ اس کا مستقبل خراب ہو جائے یا کم از کم آج سے زیادہ بدتر ہو۔ جہالت و نادانی کی بنا پر آدمی ایسا کر جائے، یا کسی وقتی خواہش کے طوفان سے مغلوب ہو کر ایسا کر گذرے تو بات دوسری ہے، ورنہ سوچ سمجھ کر تو کوئی شخص بھی اس رویّے کو صحیح و معقول قرار نہیں دیتا۔

پھر اگر تھوڑی دیر کے لئے اس دعوے کو جوں کا توں مان بھی لیا جائے کہ انسان حاضر کے اطمینان کی خاطر مستقبل کے نقصان کو گوارا کرنا درست سمجھتا ہے، تب بھی وہ استدلال ٹھیک نہیں بیٹھتا جس کی بنا اس دعوے پر رکھی گئی ہے۔ قرض لیتے وقت جو معاملہ دائن اور مدیون کے درمیان طے ہوا تھا اُس میں تو آپ کے قول کے مطابق حاضر کے ۱۰۰ روپوں کی قیمت ایک سال بعد کے ۱۰۳ روپوں کے برابر تھی۔ لیکن اب جو ایک سال کے بعد مدیون اپنا قرض ادا کرنے گیا تو واقعی صورتِ معاملہ کیا ٹھہری؟ یہ کہ حاضر کے ۱۰۳ روپے ماضی کے سو روپوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے برابر ہو گئے۔ اور اگر پہلے سال مدیون قرض ادا نہ کر سکا تو دوسرے سال کے خاتمے پر ماضی بعید کے سو روپوں کی قیمت حاضر کے ۱۲۱ روپوں کے برابر ہو گئی۔ کیا فی الواقع ماضی اور حال میں قدر و قیمت کا یہی تناسب ہے؟ اور کیا یہ اصول بھی صحیح ہے کہ جتنا جتنا ماضی پرانا ہوتا جائے اسکی قیمت بھی حال کے مقابلے میں بڑھتی چلی جائے؟ کیا پہلے گزری ہوئی ضرورتوں کی آسودگی آپ کے لئے اتنی ہی قابلِ قدر ہے کہ جو روپے آپ کو ایک مدّتِ دراز پہلے ملے تھے اور جن کو خرچ کر کے آپ کبھی کا نسیاً منسیا کر چکے ہیں، وہ آپ کے لئے زمانے کی ہر ساعت گزرنے پر حاضر کے روپوں سے زیادہ قیمتی ہوتے چلے جائیں، یہاں تک کہ اگر آپ کو سو روپے استعمال کئے ہوئے پچاس برس گزر چکے ہوں تو اب ان کی قیمت ڈھائی سو روپے کے برابر ہو جائے؟

شرح سود کی معقولیت؟ یہ ہے اُن دلائل کی کل کائنات جو سود خواری کے وکیل اسکو عقل و انصاف کی رو سے ایک جائز و مناسب چیز ثابت کرنے کے لئے پیش کرتے ہیں۔ تنقید سے آپ کو معلوم ہو گیا کہ معقولیت سے اس ناپاک چیز کو دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے کسی وزنی دلیل سے بھی اس بات کی کوئی معقول وجہ پیش نہیں کی جا سکتی کہ سود کیوں لیا اور دیا جائے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جو چیز اس قدر غیر معقول تھی، مغرب کے علما اور مفکرین نے اسکو بالکل بدیہیات و مسلّمات میں شامل کر لیا، اور نفسِ سود کی معقولیت کو گویا ایک طے شدہ صداقت اور مانی ہوئی حقیقت فرض کر کے ساری گفتگو اس امر پر مرکوز کر دی کہ شرحِ سود "معقول" ہونی چاہیئے۔ دورِ جدید کے معزبی لٹریچر میں یہ بحث تو آپ کو کم ہی کہیں ملے گی کہ سود بجائے خود لینے اور دینے کے لائق چیز بھی یا نہیں، البتہ جو کچھ بھی رد و قدح آپ ان کے ہاں دیکھیں گے وہ زیادہ تر اس امر سے متعلق ہو گی کہ فلاں شرحِ سود "بیجا" اور حدّ سے بڑھی ہوئی "ہے اس لئے قابلِ اعتراض ہے، اور فلاں شرح "معقول" ہے اس لئے قابلِ قبول ہے۔

مگر کیا فی الواقع کوئی شرحِ سود معقول بھی ہے؟ تھوڑی دیر کے لئے ہم اس سوال کو نظر انداز کئے دیتے ہیں کہ جس چیز کا بجائے خود معقول ہونا ثابت نہیں کیا جا سکتا اُس کی شرح کے معقول یا نا معقول ہونے کی بحث پیدا ہی کہاں ہوتی ہے۔ اس سوال سے قطعِ نظر کر کے ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ آخر وہ کونسی شرحِ سود ہے جس کو فطری اور معقول کہا جاتا ہے؟ اور ایک شرح کے بیجا یا بجا ہونے کا آخر معیار کیا ہے؟ اور کیا درحقیقت دنیا کے سودی کاروبار میں شرحِ سود کا تعین کسی عقلی (Rational) بنیاد پر ہو رہا ہے؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس سوال کی جب ہم تحقیق کرتے ہیں تو اوّلین حقیقت جو ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ "معقول شرحِ سود" نامی کوئی چیز دنیا میں کبھی نہیں پائی گئی ہے۔ مختلف شرحوں کو مختلف زمانوں میں معقول ٹھہرایا گیا ہے اور بعد میں وہی شرحیں نامعقول قرار دے دی گئی ہیں۔ بلکہ ایک ہی زمانہ میں ایک جگہ معقول شرح کچھ ہے اور دوسری جگہ کچھ اور۔ قدیم ہندو دور میں کوتلیہ (Kautilya) کی تصریح کے مطابق ۱۵ سے ۶۰ فی صدی سالانہ تک شرحِ سود بالکل معقول اور جائز سمجھی جاتی تھی، اور اگر خطرہ زیادہ ہو تو اس سے بھی زیادہ شرح ہو سکتی تھی۔ اٹھارویں صدی کے وسطِ آخر اور انیسویں صدی کے وسطِ اوّل میں ہندوستانی ریاستوں کے جو مالی معاملات ایک طرف دیسی ساہوکاروں سے اور دوسری طرف ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت سے ہوتے تھے اُن میں بالعموم ۴۰ فی صدی سالانہ شرح رائج تھی۔ ۱۴-۱۹۱۸ء کی جنگِ عظیم کے زمانے میں حکومتِ ہند نے ۶½ فی صدی سالانہ سود پر جنگی قرضے حاصل کیے۔ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۰ء کے درمیان کوآپریٹو سوسائٹیوں میں عام شرحِ سود ۱۲ سے ۱۵ فی صدی تک رہی۔ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کے دور میں ملک کی عدالتیں ۹ فی صدی سالانہ کے قریب شرح کو معقول قرار دیتی رہیں۔ دوسری جنگِ عظیم کے لگ بھگ زمانے میں ریزرو بینک آف انڈیا کا ڈسکونٹ ریٹ ۳ فی صدی سالانہ مقرر ہوا اور یہی شرح دورانِ جنگ میں بھی قائم رہی بلکہ پونے تین فی صدی پر بھی حکومتِ ہند کو قرضے ملتے رہے۔ یہ تو ہے خود ہمارے اپنے برعظیم کا حال۔ اُدھر یورپ کو دیکھیے تو وہاں بھی آپ کو کچھ ایسا ہی نقشہ نظر آئے گا۔ سولھویں صدی کے وسط میں انگلستان میں ۱۰ فی صدی شرح بالکل معقول قرار دی گئی تھی۔ ۱۹۲۰ء کے قریب زمانے میں یورپ کے بعض سنٹرل بینک آٹھ نو فی صدی شرح لگاتے تھے اور خود مجلس اقوام نے یورپ کی ریاستوں کو اپنی وساطت سے جو قرضے اُس دور میں دلوائے تھے ان کی شرح بھی اسی کے لگ بھگ تھی۔ مگر آج یورپ اور امریکہ میں کسی کے سامنے اس شرح کا نام لیجیے تو وہ چیخ اُٹھے گا کہ یہ شرح سود نہیں بلکہ لوٹ ہے۔ اب جدھر دیکھیے ۲½ اور ۳ فی صدی شرح کا چرچا ہے۔ ۴ فی صدی انتہائی شرح ہے، اور بعض حالات میں ایک اور ½ اور ۱½ فی صدی تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ لیکن دوسری طرف غریب عوام کو سودی قرض دینے والے مہاجنوں کے لیے انگلستان میں ۱۹۲۷ء کے منی لینڈرس ایکٹ کی رو سے جو شرح جائز رکھی گئی ہے وہ ۴۸ فی صدی سالانہ ہے اور امریکہ کی عدالتیں سُود خوار مہاجنوں کو جس شرح کے مطابق سود دلوا رہی ہیں وہ ۳۰ سے شروع ہو کر ۶۰ فی صدی سالانہ تک پہنچ جاتی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بتائیے ان میں سے کس کا نام فطری اور معقول شرحِ سود ہے؟

اب ذرا آگے بڑھ کر اس مسئلے کا جائزہ لیجیے کہ کیا فی الحقیقت کوئی شرحِ سود فطری اور معقول ہو بھی سکتی ہے؟

اس سوال پر جب آپ غور کریں گے تو آپ کی عقل خود بتا دے گی کہ شرحِ سود اگر معقول طور پر متعین ہو سکتی تھی تو صرف اس صورت میں جب کہ اُس فائدے کی قیمت مشخص ہوتی یا ہو سکتی، جو ایک شخص کسی قرض لی ہوئی رقم سے اٹھاتا ہے۔ مثلاً اگر یہ بات متعین ہو جاتی کہ ایک سال تک سو روپے کا استعمال ۲۵ روپے کے برابر فائدہ دیتا ہے تو البتہ یہ طے کیا جا سکتا تھا کہ اس فائدے میں سے ۵ یا ۲½ یا ۱¼ روپیہ اُس شخص کا فطری اور معقول حصہ ہے جس کی رقم دورانِ سال میں استعمال کی گئی ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ اس طرح سے استعمالِ سرمایہ کا فائدہ نہ تو مشخص کیا گیا ہے، نہ کیا جا سکتا ہے، اور نہ بازاری شرحِ سود کے تعین میں کبھی اس امر کا لحاظ کیا جاتا ہے کہ روپیہ قرض لینے والے کو اس سے کتنا فائدہ ہوگا، بلکہ کوئی فائدہ ہوگا بھی یا نہیں۔ عملاً جو کچھ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ مہاجنی کاروبار میں تو قرض کی قیمت قرض مانگنے والے کی مجبوری کے لحاظ سے مشخص ہوتی ہے، اور تجارتی سودخواری کی منڈی میں شرحِ سود کا اتار چڑھاؤ کچھ دوسری بنیادوں پر ہوتا رہتا ہے جن کو عقل اور انصاف سے کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔

شرحِ سود کے وجوہ | پہلی قسم کے کاروبار میں ایک مہاجن یہ دیکھتا ہے کہ جو شخص اس سے قرض مانگنے آیا ہے وہ کس حد تک غریب ہے، کتنا مجبور ہے اور قرض نہ ملنے کی صورت میں کس قدر زیادہ مبتلائے آفت ہوگا۔ انہی چیزوں کے لحاظ سے وہ طے کرتا ہے کہ مجھے اس سے کتنا سود مانگنا چاہیے۔ اگر وہ کم غریب ہے، کم رقم مانگ رہا ہے اور بہت زیادہ پریشان نہیں ہے تو شرحِ سود کم ہوگی۔ اس کے برعکس وہ جتنا زیادہ خستہ حال اور جس قدر زیادہ سخت حاجتمند ہوگا اتنی ہی شرح بڑھتی چلی جائیگی، حتیٰ کہ اگر کسی فاقہ کش آدمی کا بچہ بیماری کی حالت میں دم توڑ رہا ہو تو چار پانچ سو فی صدی شرحِ سود بھی اس کے معاملہ میں کچھ "بے جا" نہیں ہے۔ اس طرح کی صورتِ حال میں "فطری" شرحِ سود قریب قریب اُسی معیار کے لحاظ سے مشخص ہوتی ہے جس معیار کے لحاظ سے ۱۹۴۷ء کے ہنگامۂ قیامت میں امرتسر کے اسٹیشن پر ایک سکھ نے ایک مسلمان سے پانی کے ایک گلاس کی "فطری" قیمت ۳۰۰ روپے وصول کی تھی، کیونکہ اس کا بچہ پیاس سے مر رہا تھا اور پناہ گزینوں کی ٹرین سے کوئی مسلمان نیچے اتر کر خود پانی نہیں لے سکتا تھا!

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رہا دوسری قسم کا بازارِ مالیات، تو اس میں شرح سود کا تعین اور اس کا آتار چڑھاؤ جن بنیادوں پر ہوتا ہے ان کے بارے میں ماہرین معاشیات کے دو مسلک ہیں:

(۱) ایک گروہ کہتا ہے کہ طلب اور رسد کا قانون اس کی بنیاد ہے۔ جب روپیہ لگانے کے خواہشمند کم ہوتے ہیں اور قرض دینے کے قابل رقمیں زیادہ ہو جاتی ہیں تو سود کی شرح گرنے لگتی ہے، یہاں تک کہ جب وہ بہت زیادہ گر جاتی ہے تو لوگ اس موقعہ کو غنیمت سمجھ کر کاروبار میں لگانے کیلئے روپیہ قرض لینے پر بکثرت آمادہ ہونے لگتے ہیں۔ پھر جب روپے کی مانگ بڑھنی شروع ہوتی ہے اور قابل قرض رقمیں کم ہونے لگتی ہیں تو شرح سود چڑھنی شروع ہو جاتی ہے یہاں تک کہ وہ اس حد کو پہنچ جاتی ہے کہ قرض کی مانگ رک جاتی ہے۔

غور کیجئے، اس کے معنی کیا ہیں۔ سرمایہ دار یہ نہیں کرتا کہ سیدھے اور معقول طریقے سے کاروباری آدمی کے ساتھ شرکت کا معاملہ کرے اور انصاف کے ساتھ اس کے واقعی منافع میں اپنا حصہ لگائے۔ اس کے بجائے وہ ایک اندازہ کرتا ہے کہ کاروبار میں اس شخص کو کم از کم اتنا فائدہ ہو گا لہذا جو رقم میں اسے دے رہا ہوں اس پر مجھے اتنا سود ملنا چاہئیے دوسری طرف کاروباری آدمی بھی اندازہ کرتا ہے کہ جو روپے میں اس سے لیکر لگا رہا ہوں وہ مجھے زیادہ سے زیادہ اتنا نفع دے سکتا ہے لہذا سود اس سے زیادہ نہ ہونا چاہئیے۔ دونوں قیاس (Speculation) سے کام لیتے ہیں۔ سرمایہ دار ہمیشہ کاروبار کے منافع کا مبالغہ آمیز تخمینہ کرتا ہے۔ اور کاروباری آدمی نفع کی امیدوں کے ساتھ نقصان کے اندیشوں کو بھی سامنے رکھتا ہے۔ اس بنا پر دونوں کے درمیان تعاون کے بجائے ایک دائمی کشمکش برپا رہتی ہے جب کاروباری آدمی نفع کی امید پر سرمایہ لگانا چاہتا ہے تو سرمایہ دار اپنے سرمایہ کی قیمت بڑھانی شروع کر دیتا ہے یہاں تک کہ اتنی بڑھ جاتا ہے کہ اس قدر شرح سود پر روپیہ لے کر کام میں لگانا کسی طرح نفع بخش نہیں رہتا۔ اس طرح آخر کار روپے کا کام میں لگنا بند ہو جاتا ہے اور معاشی ترقی کی رفتار یکایک رک جاتی ہے۔ پھر جب کساد بازاری کا سخت دورہ پوری کاروباری دنیا پر پڑ جاتا ہے اور سرمایہ دار دیکھتا ہے کہ اس کی اپنی تباہی قریب آ لگی ہے تو وہ شرح سود کو اس حد تک گرا دیتا ہے کہ کاروباری آدمیوں کو اس شرح پر روپیہ لیکر لگانے میں نفع کی امید ہو جاتی ہے اور صنعت و تجارت کے بازار میں پھر سرمایہ آنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اگر معقول شرائط پر سرمائے اور کاروبار کے درمیان حصہ دارانہ تعاون ہوتا تو ایک ہموار طریقے سے دنیا کی معیشت کا نظام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چل سکتا تھا لیکن جب قانون نے سرمایہ دار کے لیے سود پر روپیہ چلانے کا راستہ کھول دیا تو سرمائے اور کاروبار کے باہمی تعلقات میں سٹہ بازی اور جواری پن کی روح داخل ہوگئی اور شرح سود کی کمی وبیشی ایسے قمار بازانہ تغیرات پر ہونے لگی جن کی بدولت پوری دنیا کی معاشی زندگی ایک دائمی بحران میں مبتلا رہتی ہے۔

(۲) دوسرا گروہ شرح سود کی توجیہ اس طرح کرتا ہے کہ جب سرمایہ دار روپے کو خود اپنے لیے قابل استعمال رکھنا زیادہ پسند کرتا ہے تو وہ سود کی شرح بڑھا دیتا ہے، اور جب اس کی یہ خواہش کم ہو جاتی ہے تو سود کی شرح گھٹ جاتی ہے۔ رہا یہ سوال کہ سرمایہ دار نقد روپیہ اپنے پاس رکھنے کو کیوں ترجیح دیتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ اس کے متعدد وجوہ ہیں۔ کچھ نہ کچھ روپیہ اپنی ذاتی یا کاروباری ضرورتوں کیلئے رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اور کچھ نہ کچھ ناگہانی حالات اور غیر متوقع ضروریات کے لیے بھی محفوظ رکھنا پڑتا ہے، مثلاً کسی ذاتی معاملہ میں کوئی غیر معمولی خرچ یا کسی اچھے سودے کا موقع یکایک سامنے آ جانا۔ ان دو وجوہ کے علاوہ تیسری وجہ، اور زیادہ اہم وجہ یہ ہے کہ سرمایہ دار یہ پسند کرتا ہے کہ مستقبل میں کسی وقت قیمتیں گرنے یا شرح سود چڑھنے کی صورت میں فائدہ اٹھانے کے لئے اس کے پاس نقد روپیہ کافی موجود ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان وجوہ کی بنا پر روپے کو اپنے لئے قابل استعمال رکھنے کی جو خواہش سرمایہ دار کے دل میں پیدا ہوتی ہے، کیا وہ گھٹتی بڑھتی ہے کہ اس کا اثر شرح سود کے اتار چڑھاؤ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے؟ اس کے جواب میں وہ کہتے ہیں کہ ہاں مختلف شخصی، اجتماعی، سیاسی اور معاشی اسباب سے کبھی یہ خواہش بڑھ جاتی ہے اسلئے سرمایہ دار شرح سود بڑھا دیتا ہے اور کاروبار کی طرف سرمایہ آنا کم ہو جاتا ہے۔ اور کبھی اس خواہش میں کمی آ جاتی ہے، اسلئے سرمایہ دار شرحِ سود گھٹا دیتا ہے اور اس کے گھٹنے کی وجہ سے لوگ تجارت وصنعت میں لگانے کیلئے زیادہ سرمایہ قرض لینے لگتے ہیں۔

اس خوشنما توجیہ کے پیچھے ذرا جھانک کر دیکھئے کہ کیا چیز چھپی ہوئی ہے۔ جہاں تک خانگی ضروریات، یا ذاتی کاروبار کی ضروریات کا تعلق ہے ان کی بنا پر معمولی اور غیر معمولی سب طرح کے حالات میں سرمایہ دار کی یہ خواہش کہ وہ سرمایہ کو اپنے لئے قابل استعمال رکھے بمشکل اس کے پانچ فیصدی سرمائے پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اسلئے پہلی دونوں وجہوں کو خواہ مخواہ اہمیت دینا صحیح نہیں ہے۔ اب رہا ۹۵ فیصدی سرمایہ جس کو یہ دراصل کبھی روکتا ہے اور کبھی بازار قرض کی طرف بہاتا ہے، وہ تو تیسری وجہ ہے اور اس کا تجزیہ کیجئے تو اس کے اندر سے اصل حقیقت یہ برآمد ہوگی کہ شرح سود

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کمال درجہ کی خود غرضانہ نیت کے ساتھ دنیا کے اور خود اپنے ملک و قوم کے حالات کو دیکھتا رہتا ہے۔ ان حالات میں کبھی وہ کچھ مخصوص آثار دیکھتا ہے اور انکی بنا پر چاہتا ہے کہ اس کے پاس وہ ہتھیار ہر وقت موجود رہے جس کے ذریعہ سے وہ سوسائٹی کی مشکلات آفات اور مصائب کا ناجائز فائدہ اٹھا سکے اور اسکی پریشانیوں میں اضافہ کر کے اپنی خوشحالی بڑھا سکے! اسلئے وہ سٹہ بازی کی خاطر سرمایہ کو اپنے لئے روک لیتا ہے، شرح سود بڑھا دیتا ہے، تجارت و صنعت کی طرف سرمائے کا بہاؤ یکلخت بند کر دیتا ہے اور سوسائٹی پر اس بلائے عظیم کا دروازہ کھول دیتا ہے جس کا نام "کساد بازاری" ہے پھر جب وہ دیکھتا ہے کہ اس راستے سے جو کچھ حرام خوری وہ کر سکتا تھا کر چکا؛ آگے مزید فائدے کا کوئی امکان باقی نہیں ہے، بلکہ نقصان کی سرحد قریب آ لگی ہے تو "سرمائے کو اپنے لئے قابل استعمال رکھنے کی خواہش" اس کے نفس خبیث میں کم ہو جاتی ہے اور وہ کم شرح سود کا لالچ دے کر کاروباری لوگوں کو صلائے عام دینے لگتا ہے کہ آؤ میرے پاس بہت سا روپیہ تمہارے لئے قابل استعمال پڑا ہے۔

شرح سود کی بس یہی دو توجیہات موجودہ زمانے کے ماہرین معاشیات نے کی ہیں، اور اپنی اپنی جگہ دونوں ہی صحیح ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ ان میں سے جو وجہ بھی ہو، اس سے آخر ایک "معقول" اور "فطری" شرح کس طرح متعین ہوتی یا ہو سکتی ہے؟ یا تو ہمیں عقل اور معقولیت اور فطرت کے مفہومات بدلنے پڑیں گے، یا پھر یہ ماننا پڑے گا کہ سود خود جس قدر نامعقول چیز ہے اسکی شرح بھی اتنے ہی نامعقول اسباب سے متعین ہوتی اور گھٹتی بڑھتی ہے۔

سود کا معاشی فائدہ اور اسکی ضرورت؟ اس کے بعد سود کے وکلاء یہ بحث چھیڑ دیتے ہیں کہ سود ایک معاشی ضرورت ہے اور کچھ فوائد ایسے ہیں جو اس کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے۔ اس دعوے کی تائید میں جو دلائل وہ دیتے ہیں انکا خلاصہ یہ ہے:

(۱) انسانی معیشت کا سارا کاروبار سرمائے کے اجتماع پر منحصر ہے، اور سرمائے کا جمع ہونا بغیر اس کے ممکن نہیں کہ لوگ اپنی ضروریات اور خواہشات پر پابندی عائد کریں اور اپنی ساری ساری آمدنیوں کو اپنی ذات پر خرچ نہ کر ڈالیں بلکہ کچھ نہ کچھ پس انداز بھی کرتے رہا کریں۔ یہی ایک صورت ہے سرمایہ اکٹھا ہونے کی۔ لیکن آخر ایک آدمی کیوں اپنی ضروریات کو روکنے اور کفایت شعاری کرنے پر آمادہ ہو اگر اسے اس ضبطِ نفس اور اس قربانی کا کوئی اجر نہ ملے؟ سود ہی تو وہ اجر ہے جس کی امید لوگوں کو روپیہ بچانے پر آمادہ کرتی ہے۔ تم اسے حرام کر دو گے تو سرے سے فاضل آمدنیوں کو محفوظ کرنے کا سلسلہ ہی بند ہو جائے گا جو سرمایہ کی بہم رسانی کا اصل ذریعہ ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۲) معاشی کاروبار کی طرف سرمائے کے بہاؤ کی آسان ترین صورت یہ ہے کہ لوگوں کیلئے اپنی جمع شدہ دولت کو سود پر چلانے کا دروازہ کھلا رہے۔ اس طرح سود ہی کا لالچ ان سے روپیہ جمع کراتا ہے پھر سود ہی کا لالچ ان کو اس بات پر بھی آمادہ کرتا رہتا ہے کہ اپنی پس انداز کی ہوئی رقموں کو بیکار نہ ڈال رکھیں بلکہ کاروباری لوگوں کے حوالہ کردیں اور ایک مقرر شرح کے مطابق سود وصول کرتے رہیں۔ اس دروازے کو بند کرنے کے معنی یہ ہیں کہ نہ صرف روپیہ جمع کرنے کا ایک اہم ترین محرک غائب ہو جائے، بلکہ جو تھوڑا بہت سرمایہ جمع ہو وہ بھی کاروبار میں لگنے کے لئے حاصل نہ ہو سکے۔

(۳) سود صرف یہی نہیں کرتا کہ سرمایہ جمع کراتا اور اسے کاروبار کی طرف کھینچ کر لاتا ہے، بلکہ وہی اس کے غیر مفید استعمال کو روکتا بھی ہے۔ اور شرح سود وہ چیز ہے جو بہترین طریقہ سے آپ ہی آپ اس امر کا انتظام کرتی رہتی ہے کہ سرمایہ کاروبار کی مختلف ممکن تجویزوں میں سے اُن تجویزوں کی طرف جائے۔ جو اُن میں سب سے زیادہ بارآور ہوں۔ اس کے سوا کوئی تدبیر ایسی سمجھ میں نہیں آتی جو مختلف عملی تجویزوں میں سے نافع کو غیر نافع سے اور زیادہ نافع کو کم نافع سے ممیز کر کے اور انفع کی طرف سرمائے کا رخ پھیرتی رہے۔ تم سود کو اڑا دوگے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اول تو لوگ بڑی بے پروائی سے سرمایہ استعمال کرنے لگیں گے، اور پھر بلا لحاظِ نفع و نقصان، ہر طرح کے الٹے سیدھے کاموں میں اسے لگانا شروع کر دینگے۔

(۴) قرض وہ چیز ہے جو انسانی زندگی کی ناگزیر ضروریات میں سے ہے۔ افراد کو بھی اپنے ذاتی معاملات میں اس کی ضرورت پیش آتی ہے، کاروباری لوگوں کو بھی آئے دن اسکی حاجت رہتی ہے، اور حکومتوں کا کام بھی اس کے بغیر نہیں چل سکتا۔ اس کثرت سے اتنے بڑے پیمانے پر قرض کی بہم رسانی آخر نری خیرات کے بل پر کہاں تک ہو سکتی ہے۔ اگر تم صاحبِ سرمایہ لوگوں کو سود کا لالچ نہ دوگے اور اس امر کا اطمینان بہم نہ پہنچاؤ گے کہ ان کے راس المال کے ساتھ ان کا سود بھی ان کو ملتا رہیگا تو وہ مشکل ہی قرض دینے پر آمادہ ہوں گے اور اس طرح قرضوں کی بہم رسانی رک جانے کا نہایت برا اثر پوری معاشی زندگی پر مترتب ہوگا۔ ایک غریب آدمی کو اپنے برے وقت پر مہاجن سے قرض مل تو جاتا ہے۔ سود کا لالچ نہ ہو تو اُس کا مردہ بے کفن ہی پڑا رہ جائے اور کوئی اسکی طرف مدد کا ہاتھ نہ بڑھائے۔ ایک تاجر کو تنگ موقع پر سودی قرض فوراً مل جاتا ہے اور اس کا کام چلتا رہتا ہے۔ یہ دروازہ بند ہو جائے تو نہ معلوم کتنی مرتبہ اس کا دیوالہ نکلنے کی نوبت آجائے۔ ایسا ہی معاملہ حکومتوں کا بھی ہے کہ ان کی ضرورتیں سودی قرض ہی سے پوری ہوتی رہتی ہیں، ورنہ کروڑوں روپے فراہم کرنے والے سخی داتا آخر انہیں روز روز کہاں مل سکتے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آئیے اب ہم ان میں سے ایک ایک "فائدے" اور "ضرورت" کا جائزہ لے کر دیکھیں کہ آیا فی الحقیقت وہ کوئی فائدہ اور ضرورت ہے بھی یا یہ سب کچھ محض ایک شیطانی وسوسہ ہے۔

اولین غلط فہمی یہ ہے کہ معاشی زندگی کے لئے افراد کی کفایت شعاری اور زراندوزی کو ایک ضروری اور مفید چیز سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ درحقیقت ساری معاشی ترقی و خوشحالی منحصر ہے اس پر کہ جماعت بحیثیت مجموعی جتنا کچھ سامانِ زیست پیدا کرتی جائے وہ جلدی جلدی فروخت ہوتا چلا جائے تاکہ پیداوار اور اس کی کھپت کا چکر توازن کے ساتھ اور تیز رفتاری کے ساتھ چلتا رہے۔ یہ بات صرف اُسی صورت میں حاصل ہوسکتی ہے جب کہ لوگ بالعموم اس امر کے عادی ہوں کہ معاشی سعی و عمل کے دوران میں جتنی کچھ دولت ان کے حصہ میں آئے اسے صرف کرتے رہیں اور ایسے قدر فراخ دل ہوں کہ اگر ان کے پاس ان کی ضرورت سے زیادہ دولت آگئی ہو تو اسے جماعت کے کم نصیب افراد کی طرف منتقل کر دیا کریں تاکہ وہ بھی بفراغت اپنے لئے ضروریاتِ زندگی خرید سکیں۔ مگر تم اس کے برعکس لوگوں کو یہ سکھاتے ہو کہ جس کے پاس ضرورت سے زیادہ دولت پہنچ گئی ہو وہ اسے روک رکھے اور جس کے پاس بقدرِ ضرورت دولت پہنچی ہو وہ بھی کنجوسی برت کر جسے تم ضبطِ نفس اور زہد اور قربانی وغیرہ الفاظ سے تعبیر کرتے ہو اپنی مناسب ضروریات کا ایک اچھا خاصا حصہ پورا کرنے سے باز رہے اور اس طرح ہر شخص زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنے کی کوشش کرے۔ تمہارے نزدیک اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ سرمایہ اکٹھا ہو کر صنعت و تجارت کی ترقی کے لئے بہم پہنچ سکیگا۔ لیکن درحقیقت اس کا نقصان یہ ہوگا کہ جو مال اس وقت بازار میں موجود ہے اس کا ایک بڑا حصہ یونہی پڑا رہ جائیگا۔ کیونکہ جن لوگوں کے اندر قوتِ خرید پہلے ہی کم تھی وہ تو استطاعت نہ ہونے کی وجہ سے بہت سا مال نہ خرید سکے اور جو بقدرِ ضرورت خرید سکتے تھے انہوں نے استطاعت رکھنے کے باوجود پیداوار کا اچھا خاصہ حصہ نہ خریدا اور جن کے پاس ان کی ضرورت سے زیادہ قوتِ خریداری پہنچ گئی تھی انہوں نے بھی اُسے اپنے پاس روک کر رکھ لیا۔ اب اگر ہر معاشی چکر میں یہی ہوتا رہے کہ بقدرِ ضرورت اور مازاد از ضرورت قوتِ خرید پانے والے لوگ اپنی اس قوت کے بڑے حصے کو نہ تو خود پیداوار کے خریدنے میں استعمال کریں نہ کم قوتِ خرید رکھنے والوں کو دیں بلکہ اسے روکتے اور جمع کرتے چلے جائیں تو اس کا حاصل یہ ہوگا کہ ہر چکر میں جماعت کی معاشی پیداوار کا معتدبہ حصہ فروخت سے رکتا چلا جائے گا۔ مال کی کھپت کم ہونے سے روزگار میں کمی واقع

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہو گی۔ روزگار کی کمی آمدنیوں کی کمی پر منتج ہو گی۔ اور آمدنیوں کی کمی سے پھر اموالِ تجارت کی کھپت میں مزید کمی رونما ہوتی چلی جائیگی۔ اس طرح چند افراد کی زراندوزی بہت سے افراد کی بدحالی کا سبب بنے گی اور آخرکار یہ چیز خود ان زراندوز افراد کے لئے بھی وبالِ جان بن جائیگی، کیونکہ جس دولت کو وہ خریداری میں استعمال کرنے کے بجائے سمیٹ سمیٹ کر مزید پیداوار میں استعمال کریں گے آخر اس کے ذریعہ سے تیار کی ہوئی پیداوار کھپے گی کہاں؟

اس حقیقت پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اصل معاشی ضرورت تو اُن اسباب اور محرکات کو دور کرنا ہے جن کی بنا پر افراد اپنی آمدنیوں کو خرچ کرنے کے بجائے روک رکھنے اور جمع کرنے کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ ساری جماعت کی معاشی فلاح یہ چاہتی ہے کہ ایک طرف اجتماعی طور پر ایسے انتظامات کر دیئے جائیں جن کی بدولت ہر شخص کو اپنے برے وقت پر مالی مدد مل جایا کرے تاکہ لوگوں کو اپنی آمدنیاں جمع کرنے کی حاجت ہی نہ محسوس ہو، اور دوسری طرف جمع شدہ دولت پر زکوٰۃ عائد کی جائے تاکہ لوگوں کے اندر جمع کرنے کا میلان کم ہو اور اس کے باوجود جو دولت رک جائے اس کا ایک حصہ بہرحال ان لوگوں تک پہنچتا رہے جنہوں نے گردشِ دولت میں سے کم حصہ پایا ہے۔ لیکن تم اس کے برعکس سود کا لالچ دے دے کر لوگوں کے طبعی بخل کو اور زیادہ اکساتے اور جو بخیل نہیں ہیں ان کو بھی یہ سکھاتے ہو کہ وہ خرچ کرنے کے بجائے مال جمع کریں۔

پھر اس غلط طریقے سے اجتماعی مفاد کے خلاف جو سرمایہ اکٹھا ہوتا ہے اسکو تم پیدائشِ دولت کے کاروبار کی طرف لاتے بھی ہو تو سود کے راستے سے لاتے ہو۔ یہ اجتماعی مفاد پر تمہارا ایک اور ظلم ہے۔ اگر یہ اکٹھی کی ہوئی دولت اس شرط پر کاروبار میں لگتی کہ جتنا کچھ منافع کاروبار میں ہو گا اس میں سے سرمایہ دار کو اس تناسب کے مطابق حصہ مل جائیگا تب بھی چنداں مضائقہ نہ تھا۔ مگر تم اسکو اس شرط پر لگاتے ہو کہ کاروبار میں چاہے منافع ہو یا نہ ہو اور چاہے کم منافع ہو یا زیادہ، بہرحال سرمایہ دار اِس قدر فی صدی منافع ضرور پائے گا۔ اس طرح تم نے اجتماعی معیشت کو دوہرا نقصان پہنچایا۔ ایک نقصان وہ جو روپے کو خرچ نہ کرنے اور روک رکھنے سے پہنچا۔ اور دوسرا یہ کہ جو روپیہ روکا گیا تھا وہ اجتماعی معیشت کی طرف پلٹا بھی تو حصہ داری کے اصول پر کاروبار میں شریک نہیں ہوا بلکہ قرض بن کر پورے معاشرے کی صنعت و تجارت پر لد گیا اور تمہارے قانون نے اسکو یقینی منافع کی ضمانت دے دی اب تمہارے اِس غلط نظام کی وجہ سے صورت حال یہ ہو گئی ہے کہ معاشرے کے بکثرت افراد اُس قوتِ خریداری کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جو انہیں حاصل ہوتی ہے، اجتماعی پیداوار کی خریداری میں صرف کرنے کے بجائے روک روک کر ایک سود طلب قرضے کی شکل میں معاشرے کے سر پر لاتے چلے جاتے ہیں۔ اور معاشرہ اس روز افزوں پیچیدگی میں مبتلا ہو گیا ہے کہ آخر وہ اس ہر لحظہ بڑھنے والے قرض و سود کو کس طرح ادا کرے جب کہ اس سرمائے سے تیار کیے ہوئے مال کی کھپت بازار میں مشکل ہے اور مشکل تر ہوتی جا رہی ہے۔ لاکھوں کروڑوں آدمی اسے اس لئے نہیں خریدتے کہ ان کے پاس خریدنے کے لئے پیسہ نہیں۔ اور ہزارہا آدمی اسکو اس لئے نہیں خریدتے کہ وہ اپنی قوت خریداری کو مزید سود طلب قرض بنانے کے لئے روکتے چلے جا رہے ہیں۔

تم اس سود کا یہ فائدہ بتاتے ہو کہ اُس کے دباؤ کی وجہ سے کاروباری آدمی مجبور ہوتا ہے کہ سرمائے کے فضول استعمال سے بچے اور اسکو زیادہ سے زیادہ نفع بخش طریقے سے استعمال کرے۔ تم شرحِ سود کی یہ کرامت بیان کرتے ہو کہ وہ خاموشی کے ساتھ کاروبار کی ہدایت و رہنمائی کا فریضہ انجام دیتی رہتی ہے اور یہ اسی کا فیضان ہے کہ سرمایہ اپنے بہاؤ کے لئے تمام ممکن راستوں میں سے اُس کاروبار کے راستے کو چھانٹ لیتا ہے جو سب سے زیادہ نافع ہوتا ہے۔ لیکن ذرا اپنی اس سخن سازی کے پردے کو ہٹا کر دیکھو کہ اس کے نیچے اصل حقیقت کیا چھپی ہوئی ہے۔ دراصل سود نے پہلی خدمت تو یہ انجام دی کہ "فائدے" اور "منفعت" کی تمام دوسری تفسیریں اس کے فیض سے متروک ہو گئیں اور ان الفاظ کا صرف ایک ہی مفہوم باقی رہ گیا، یعنی "مالی فائدہ" اور "مادی منفعت"۔ اس طرح سرمائے کو بڑی یکسوئی حاصل ہو گئی۔ پہلے وہ اُن راستوں کی طرف بھی چلا جایا کرتا تھا جن میں مالی فائدے کے سوا کسی اور قسم کا فائدہ ہوتا تھا۔ مگر اب وہ سیدھا اُن راستوں کا رُخ کرتا ہے جدھر مالی فائدے کا یقین ہوتا ہے۔ پھر دوسری خدمت وہ اپنی شرحِ خاص کے ذریعہ سے یہ انجام دیتا ہے کہ سرمائے کے مفید استعمال کا معیار سوسائٹی کا فائدہ نہیں بلکہ صرف سرمایہ دار کا فائدہ بن جاتا ہے۔ شرحِ سود یہ طے کر دیتی ہے کہ سرمایہ اُس کام میں صرف ہو گا جو مثلاً ۶ فی صدی سالانہ یا اس سے زیادہ منافع دے سکتا ہو۔ اس سے کم نفع دینے والا کوئی کام اس قابل نہیں ہے کہ اس پر مال صرف کیا جائے۔ اب فرض کیجیے کہ ایک اسکیم سرمایہ کے سامنے یہ آتی ہے کہ ایسے مکانات تعمیر کیے جائیں جو آرام دہ بھی ہوں اور جنہیں غریب لوگ کم کرایہ پر لے سکیں۔ اور دوسری اسکیم یہ آتی ہے کہ ایک شاندار سینما تعمیر کیا جائے۔ پہلی اسکیم ۴ فی صدی سے کم منافع کی امید دلاتی ہے اور دوسری اسکیم اس سے زیادہ نفع دیتی نظر آتی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوسرے حالات میں تو اس کا امکان تھا کہ سرمایہ "نادانی" کے ساتھ پہلی اسکیم کی طرف بہ جاتا، یا کم از کم ان دونوں کے درمیان متردد ہو کر استخارہ کرنے کی ضرورت محسوس کرتا۔ مگر یہ شرحِ سود کا فیضِ ہدایت ہے کہ وہ سرمایہ کو بلا تامل دوسری اسکیم کا راستہ دکھا دیتا ہے اور پہلی اسکیم کو اس طرح پیچھے پھینکتا ہے کہ سرمایہ اسکی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ اس پر مزید کرامت شرحِ سود میں یہ ہے کہ وہ کاروباری آدمی کو مجبور کر دیتی ہے کہ وہ ہر ممکن طریقہ سے ہاتھ پاؤں مار کر اپنے منافع کو اس حد سے اوپر ہی اوپر رکھنے کی کوشش کرے جو سرمایہ دار نے کھینچ دی ہے، خواہ اس غرض کے لئے اسکو کیسے ہی غیر اخلاقی طریقے اختیار کرنے پڑیں۔ مثلاً اگر کسی شخص نے ایک فلم کمپنی قائم کی ہے اور جو سرمایہ اس میں لگا ہوا ہے اسکی شرحِ سود ۶ فی صدی سالانہ ہے تو اسکو لامحالہ وہ طریقے اختیار کرنے پڑیں گے جن سے اس کے کاروبار کا منافع ہر حال میں اس شرح سے زیادہ رہے۔ یہ بات اگر ایسے فلم تیار کرنے سے حاصل نہ ہو سکے جو اخلاقی حیثیت سے پاکیزہ اور علمی حیثیت سے مفید ہوں، تو وہ مجبور ہوگا کہ عریاں اور فحش کھیل تیار کرے اور ایسے ایسے طریقوں سے ان کا اشتہار دے جن سے عوام کے جذبات بھڑکیں اور وہ شہوانیت کے طوفان میں بہ کر اس کے کھیل دیکھنے کے لئے جوق در جوق امنڈ آئیں۔

یہ ہے اُن فوائد کی حقیقت جو تمہارے نزدیک سود سے حاصل ہوتے ہیں اور جن کے حصول کا کوئی ذریعہ سود کے سوا نہیں ہے۔ اب ذرا اُس ضرورت کا جائزہ بھی لے لیجئے جو آپ کے نزدیک سود کے بغیر پوری نہیں ہو سکتی۔ بلاشبہ قرض انسانی زندگی کی ضروریات میں سے ہے۔ اسکی ضرورت افراد کو اپنی شخصی حاجات میں بھی پیش آتی ہے، صنعت اور تجارت اور زراعت وغیرہ معاشی کاموں میں بھی ہر وقت اسکی مانگ رہتی ہے اور حکومت سمیت تمام اجتماعی ادارے بھی اس کے حاجتمند رہتے ہیں۔ لیکن یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ سود کے بغیر قرض کی بہم رسانی غیر ممکن ہے۔ دراصل یہ صورتِ حال کہ افراد سے لے کر قوم تک کسی کو بھی ایک پیسہ بلا سود قرض نہیں ملتا، اس وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ آپ نے سود کو قانوناً جائز کر رکھا ہے۔ اس کو حرام کیجئے اور معیشت کے ساتھ اخلاق کا بھی وہ نظام اختیار کیجئے جو اسلام نے تجویز کیا ہے، پھر آپ دیکھیں گے کہ شخصی حاجات، اور کاروبار، اور اجتماعی ضروریات، ہر چیز کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لئے قرض بلا سود ملنا شروع ہو جائے گا، بلکہ عطیئے تک ملنے لگیں گے۔ اسلام عملاً اس کا ثبوت دے چکا ہے۔ صدیوں مسلمان سوسائٹی سود کے بغیر بہترین طریقہ پر اپنی معیشت کا سارا کام چلاتی رہی ہے۔ آپ کے اس منحوس دورِ سود خواری سے پہلے کبھی مسلمان سوسائٹی کا یہ حال نہیں رہا ہے کہ کسی مسلمان کا جنازہ اس لئے بے کفن پڑا رہ گیا ہو کہ اس کے وارث کو کہیں سے بلا سود قرض نہیں ملا، یا مسلمانوں کی صنعت و تجارت اور زراعت اس لئے بیٹھ گئی ہو کہ کاروباری ضروریات کے مطابق قرضِ حَسَن بہم پہنچنا غیر ممکن ثابت ہوا، یا مسلمان حکومتیں رفاہ عام کے کاموں کے لئے اور جہاد کے لئے اس وجہ سے سرمایہ نہ پا سکی ہوں کہ ان کی قوم سود کے بغیر اپنی حکومت کو روپیہ دینے پر آمادہ نہ تھی۔ لہٰذا آپ کا یہ دعوےٰ کہ قرضِ حسن ناقابل عمل ہے اور قرض و استقراض کی عمارت صرف سود ہی پر کھڑی ہو سکتی ہے، کسی منطقی تردید کا محتاج نہیں ہے ہم اپنے صدیوں کے عمل سے اسے غلط ثابت کر چکے ہیں۔

یہ بحث کہ آج اس زمانے کی معاشی ضروریات کے لیئے قرض بلا سود کی بہم رسانی عملاً کس طرح ہو سکتی ہے، ہمارے اس باب کے موضوع سے خارج ہے۔ اس پر ہم بعد کے ایک باب میں گفتگو کریں گے:

"حیاتِ نو" ہفتہ وار حیدرآباد (دکن)

ہندوستان میں تحریک اسلامی کا ممتاز داعی

حیات نو تقریباً چار سال سے مسلسل دین حق کی اشاعت میں مصروف ہے ——— جنوری ۱۹۵۰ء سے اضافۂ صفحات، نئی ترتیب، اور نئے انتظامات کے تحت ٹائٹل کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔

علمی مضامین، دلچسپ تنقیدیں، معیاری افسانے، بلند پایہ منظومات، ہندوستان میں تحریک اسلامی کے تازہ کوائف، نئے اسلوب، شگفتہ ترتیب "حیات نو" کی خصوصیات میں شامل ہیں۔

چندہ سالانہ ۹ روپیہ   ششماہی ۵ روپیہ   سہ ماہی ۳ روپیہ   فی پرچہ ۳ آنے

۳۱ دسمبر ۱۹۴۹ء تک خریدار بننے والوں کو سالانہ خریداری پر ایک روپیہ کی خاص رعایت کی جائے گی۔

دیانتدار ایجنٹوں کی ضرورت ہے۔

پتہ:۔ "حیات نو" ہفتہ وار حیدرآباد دکن (انڈیا)۔

© rasailojaraid.com